ہفت روزہ
الفتح
کراچی

۲۱ اکتوبر
— تا —
۲۸ اکتوبر ۱۹۷۱ء

قیمت : ۵۰ پیسے
ہوائی ڈاک سے : ۵ پیسے

جماعت اسلامی کی مسلح سرگرمیاں

صادقین — تازہ ترین شاہکار

— اندر ملاحظہ کیجئے —



جاناں کے قدم چوم کے آپہنچے ہیں
ہم چاروں طرف گھوم کے آپہنچے ہیں
غائب ہے کدھر؟ ہم سرِ مقتل جلّاد
لہراتے ہوئے جھوم کے آپہنچے ہیں

معیار پہ دل اپنا پرکھ کر لائے
جو عشق کی لذّت ہے وہ چکھ کر لائے
مقتل میں وہ جلّاد نے بغلیں جھانکیں
ہم سر کو ہتھیلی پہ جو رکھ کر لائے

خود رکھ کے ہتھیلی پہ جو سر لایا ہوں
نصرت کا پھریرا ہوں کہ لہرایا ہوں
محبوب کے تخلیئے میں جیسے پہنچا
اُس شان سے مقتل کی طرف آیا ہوں

ہم پر کرم حُسن جو بے حد ہوگا
پر نور اگر عالمِ آمد ہوگا
گردن زدنی اِس کی سزا ہے تو کیا
ہم سے یہ گناہِ عشق سرزد ہوگا

ٹیلی ویژن کے راجہ اندر سے ہوشیار ❀ امریکی سی آئی اے کے مقابلے میں روسی کے جی بی

غزل

کبھی تو یاد تری دادِ نارسائی دے
کہیں تو ذہن سے باہر مجھے دکھائی دے

میں تھک گیا ہوں تری خامشی کے افسوں سے
سکوتِ خلوتِ جاں میں مجھے سنائی دے

کوئی گلہ، کوئی دشنام، کوئی سنگِ ستم
کوئی صِلہ، کوئی انعامِ آشنائی دے

تجھے میں اپنی تمنّا سے کر چکا آزاد
مجھے بھی اپنے تصوّر سے اب رہائی دے

وہ کربِ ہجر و تمنّا میں کیوں گنوائے عُمر
غرورِ حُسن جسے نازِ کبریائی دے

اُٹھائیں مژدۂ تکمیلِ آرزو کا سوال
پھر اس کے بعد جو غم تری کج ادائی دے

سحرؔ یہ کیا ہوس خندہ زن ہو جذبوں پر
لہُو کو طعنہ و دشنام روشنائی دے

سحرؔ انصاری

خُدا کی بستی کے مظلوم عوام کا ترجمان

ہفت روزہ
الفتح
کراچی

جلد: ۲ شمارہ ۲۳-۲۴
۲۱-۲۸ اکتوبر ۱۹۷۱ء

نگران
شوکت صدیقی
محمود شام

مدیر
ارشاد راؤ

معاونین خصوصی
ابراہیم جلیس، افضل صدیقی، عبدالحمید چھاپرا

مجلسِ ادارت
وہاب صدیقی - نعیم آروی

آرٹ ایڈیٹر
غلام نبی بزمی

عکاس :— الطاف رانا

	فی پرچہ	سالانہ	ششماہی
بدلِ اشتراک	۵۰ پیسے	۲۵ روپے	۱۳ روپے
ہوائی ڈاک سے	۷۵ پیسے	۳۰ روپے	۱۶ روپے

بحرین، کویت :- ۶۰ فلس دوبئی، قطر: ۷۵ درم
سعودی عرب :- ۱۵ قرش - انگلستان ۲ شلنگ ۶ پنس

مقام اشاعت
ہفت روزہ الفتح ۲۸ ڈی، ترسری کمرشل ایریا
پی، ای - سی - ایچ - ایس کراچی-۲۹

ایڈیٹر پبلشر، ارشاد راؤ
مطبع حقی آفسٹ پریس، لیاقت آباد - کراچی

اداریہ

جنگ میں عوام کو شریک کیجئے

جنگ ہونے والی ہے
جنگ کا کوئی امکان نہیں

جماعت اسلامی کا میاں طفیل گروپ جو اپنے طور پر سرکاری ترجمان بنا ہُوا ہے اور نوکر شاہی کو باور کرا چکا ہے کہ مشرقی پاکستان کے ضمنی انتخابات میں جماعتِ اسلامی اکثریتی پارٹی کی حیثیت سے اُبھرے گی۔ جنگ کا بھُوت سوار کرنے میں پیش پیش ہے۔ اس کی آڑ میں ذرائع پیداوار اور آمدنی پر قابض مٹھی بھر اجارہ داروں نے ذخیرہ اندوزی اور نفع خوری کی رفتار پہلے سے کئی گنا تیز کر دی ہے۔ بے روزگاری کی شرح آسمان سے باتیں کرنے لگی ہے اور مزدوروں اور کسانوں پر سختیاں کہیں زیادہ ہوگئی ہیں۔

اس عالم میں پاکستان پیپلز پارٹی کے چیئرمین مسٹر زیڈ۔اے۔بھٹو نے خیال ظاہر کیا ہے کہ بھارت اور پاکستان کے درمیان جنگ کا کوئی امکان نہیں۔ مسٹر بھٹو کا خیال قرین قیاس ہے آج کے دور میں جنگ معمولی بات نہیں۔ بھارت اور پاکستان اب تک ۱۹۶۵ء کی جنگ کے اثرات سے نمٹ رہے ہیں۔ دوبارہ جنگ مزید تباہی کا پیش خیمہ ثابت ہوگی اور یہ اُسی صورت میں ممکن ہے کہ حملہ آور بھارت عالمی جنگ کو دعوت دے کر عوام کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کے درپے ہو۔

جہاں تک پاکستانی عوام کا تعلق ہے وہ ہمیشہ سے حالتِ جنگ میں رہے ہیں۔ حکمران طبقہ اس سے بخوبی آگاہ ہے کہ وہ بڑے سے بڑے دُشمن کے دانت کھٹے کرنے کے اہل ہیں۔ اس لئے ضرورت ہے کہ انھیں مزید طاقتور بنایا جائے۔ پہلا مرحلہ جمہوریت کی بحالی ہونا چاہیئے۔ اقتدار عوام کے پارلیمانی نمائندوں کے سُپرد کر دیا جائے اور افواج کو سول امور سے بالکل فارغ کر دیا جائے۔ پارلیمان میں بیٹھنے والے عوام کو اندرونی دُشمنوں یعنی سرمایہ داروں اور جاگیرداروں سے نجات دلائیں۔ نوکر شاہی کو لگام دیں اور بھارت کو کچلنے سے پہلے ملک دشمن اور عوام دُشمن طاقتوں کو کیفرِ کردار تک پہنچائیں۔

ایک بار عوام پر یہ ثابت کرنے کی ضرورت ہے کہ یہ ملک اُن کا ہے۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ میں فوج میں مزدوروں اور کسانوں کے بیٹوں اور شہری محاذ پر مظلوم طبقے نے جو قربانیاں دیں وہ تاریخی اور مثالی ہیں۔ اس کے بعد جاگیرداروں اور نوکر شاہی نے انہی عوام پر جو ظلم و تشدد روا رکھا، وہ بھی سب کے سامنے ہے۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ یہ سلوک اپنے ہم وطنوں سے نہیں بلکہ دُشمنوں سے کیا جا رہا ہے۔

اِن حالات میں عوام کو اعتماد میں نہ لیا گیا تو خاکم بدہن ہم سرخرو نہ ہوں گے۔ سوچئے کہ کون ہے جو اپنے دُشمن کو زندہ رکھنے کے لئے اپنا خون نچھاور کرے گا۔ صرف وطن اور اپنے وطن کو بچانے کے لئے ہی جان عزیز کا نذرانہ پیش کیا جا سکتا ہے۔ اور وطن کو بچانے کا مقصد بارہ کروڑ عوام کو بچانا ہے۔ چند مٹھی بھر افراد کے کارخانوں، دولت اور وقار کو بچانا نہیں ہے۔ اس وقت ملک اقتصادی مشکلات سے دوچار ہے۔ حکومت کو چاہیئے کہ تمام صنعتکاروں اور زمینداروں سے جبری ٹیکس وصول کرے تاکہ ملک میں مہنگائی کو روکا جا سکے اور عوام پر اتنا بوجھ نہ پڑ جائے کہ اقتصادی پریشانیاں جذبات میں حائل ہونے لگیں۔

کھیل کے وڈیرے — ہمیں لے ڈوبے

لطافت علی صدیقی

مسیبے، آج پھر نہایت دکھ کے ساتھ ہاکی اور اس کی متعصبانہ انتخاب کے بارے میں قلم اٹھا رہا ہوں۔ اس مرتبہ دکھ اپنی شدت کو پہنچ چکا ہے اور زخم مندمل ہونے والے نہیں لگتے۔

میں نے جیسا کہ اپنے گذشتہ کالم میں لکھا تھا کہ ہمیں اپنی قومی ٹیم کی کامیابی کے لئے دعا کرنی چاہئیے لیکن اب کے ہمیں دعا بھی شکست سے نہیں بچا سکی۔ ہماری ٹیم کے کھیل کا آغاز آسٹریلیا کے خلاف بڑی مشکل سے دو گول کی کامیابی سے ہوا پھر بھی تشویش کی کوئی بات نہیں تھی کیونکہ ہم نے آسٹریلیا کے خلاف پانچ گول کئے تھے اور اس طرح میکسیکو اولمپک میں نقرئی تمغہ جیتنے والی ٹیم کے خلاف کے دو گرانقدر پوائنٹ حاصل کر لئے تھے دوسرا میچ ہم نے مشکل سے جیتا ریہ جاپان کے خلاف تھا جسے ہم نے صرف ایک گول سے ہرایا۔ فل بیک تنویر ڈار جس نے آسٹریلیا کے خلاف پہلے میچ میں تین گول کئے تھے۔ دوسرے میچ میں بھی اس نے گول کیا۔

اصل مصیبت اس وقت آئی جب تیسرے میچ میں ہالینڈ کے خلاف ہماری ٹیم کو کھیلنا دشوار ہو گیا۔ یہ وہی ہالینڈ تھا۔ جسے ۱۹۶۸ء کے گذشتہ عالمی کھیلوں میں ہم نے ۶ کے مقابلے میں صفر سے ہرایا تھا۔ اب ہالینڈ نے ہمارے خلاف پہلا گول کیا۔ یہ پھر تنویر ڈار تھے جنہوں نے پھر یک مشت ہالینڈ کے خلاف تین کے مقابلے تین گول کر کے میچ برابر کر لیا پھر اگلے دن اس مدافعت پر مجبور ٹیم نے اسپین کے تین گولوں کے مقابلے میں دو گول کر کے شکست بھی کھالی۔

گروپ بی میں یہ پاکستان کا آخری میچ تھا۔ اور پاکستان نے صرف پانچ پوائنٹ حاصل کئے تھے یہ ہماری ٹیم کا بدترین ریکارڈ تھا کہ چار میچوں میں صرف آٹھ گول کئے۔

آج (۲۰ اکتوبر) کو صورت حال یہ ہے کہ کوئی معجزہ ہی پاکستان کو پھر کھیل کے میدان میں لا سکتا ہے ورنہ ہم مقابلے سے باہر جا چکے ہیں اسپین نے پاکستان کو شکست دینے کے بعد پانچ پوائنٹ حاصل کر لئے ہیں جب کہ ایک اور میچ کھیلنا ہے۔ وہ ہم سے پہلے ہی بہتر حیثیت میں ہیں کیونکہ ان کے پوائنٹ ہمارے مساوی ہیں لیکن گولوں کی اوسط زیادہ اچھی ہے اس لئے اسپین سیمی فائنل میں چلا جائے گا۔ بی گروپ کی ایک اور ٹیم کے بھی سیمی فائنل میں چلے جانے کی توقع ہے ہالینڈ نے آسٹریلیا کو ہرا کر چار پوائنٹ حاصل کر لیے ہیں اور اسے بھی ایک اور میچ کھیلنا ہے۔ اس کا آخری میچ کمزور جاپان کے مقابلے میں ہو گا۔ اگر وہ جیت گیا تو وہ سیمی فائنل میں جانے والی دوسری ٹیم ہو گی۔ اگر وہ برابر رہی تو اس کے پوائنٹ بڑھ کر پانچ ہو جائیں گے۔ ہالینڈ کی گولوں کی اوسط ہم سے بہتر ہے اور اس طرح اسے پاکستان پر برتری حاصل ہو گی۔

پاکستان سیمی فائنل میں اسی صورت میں پہنچ سکتا ہے۔ جب جاپان ہالینڈ کو ہرا دے، لیکن یہ تقریباً ناممکن ہے۔

سو آج ہمارا یہ حال ہے ہم عالمی چیمپئن ہیں لیکن ہم ہالینڈ اور اسپین کو شکست دینے میں ناکام رہے ہیں۔ حالانکہ آگے اس سے زیادہ ہمت طلب مقابلے تھے کیونکہ اسے بھارت اور مغربی جرمنی سے مقابلے کرنا ہوتا جو گروپ اے میں ہیں ان سے سیمی فائنل یا فائنل میں رن پڑا۔

"الفتح" کے گذشتہ کالموں میں قومی ہاکی ٹیم کے انتخابات کے سلسلے میں پاکستان ہاکی فیڈریشن کی اقرباپروری اور دوست نوازی کا تذکرہ کیا جا چکا ہے جب ہماری مدافعت کی طاقت ختم ہوئی ہو گی تو ریاض الدین کی کمی ضرور محسوس کی گئی ہو گی۔ میں نے پہلے بھی لکھا تھا کہ ریاض الدین کے ساتھ آنکھ مچولی اور بلی چوہے کا کھیل بند کیا جائے۔ ریاض کو تو کوئی نقصان نہیں ہوا نقصان تو قوم کو ہوا، جس کا وقار خاک میں مل گیا اور ایسے وقت میں جب کہ ہمیں اپنا وقار قائم رکھنے کی شدید ضرورت تھی۔ برطانیہ میں ہم نے کرکٹ سیریز ہاری تہران میں ہماری باکسنگ کے میدان میں عظمت زمین پر آ رہی اور اب ہماری ہاکی کی آخری ساکھ بھی خطرے میں ہے یہ سب کچھ چار مہینے میں ہوا ہے۔

یہ ہمیں کیا ہو گیا ہے؟

آج پاکستان کا ہر کھیلاڑی اور کھیل سے دلچسپی رکھنے والا ہر پاکستانی اس امر کو روح کی گہرائیوں کے ساتھ محسوس کر رہا ہے؟

ناکامیوں بدنامیوں اور مایوسیوں کا یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہے گا۔ جب تک کھیل کے "وڈیروں" کو سخت ترین سزا نہ دی جائے کیونکہ ان وڈیروں کی کھیل کی تنظیموں پر بیس برس سے زیادہ طویل عرصہ سے اجارہ داری چلی آ رہی ہے ایوب خان کی طرح ان کے اقتدار کے عشرے بھی انجام کو پہنچنے چاہئیں۔

ضروری تصحیح

اسی شمارہ میں صفحہ ۱۱ پر "ایران کے عوام کیا چاہتے ہیں؟" کے عنوان سے مضمون میں سہواً لکھا گیا کہ "ڈاکٹر مصدق کو قتل کروا دیا گیا"۔ حقیقتاً ڈاکٹر مصدق کو محروم اقتدار کر کے پابند سلاسل کر دیا گیا۔ کئی برسوں کے بعد رہا کیا گیا اور کچھ عرصہ کے بعد وہ طبعی موت مر گئے۔ قارئین کرام تصحیح کر لیں۔ ادارہ اس سہو کے لئے معذرت خواہ ہے۔

پروفیسر غلام اعظم کے پردے میں کون بول رہا ہے؟

جنگ کا خطرہ

بحالیٔ جمہوریت کی راہ نہیں روک سکتا

محمود شام

"ایک دکاندار کہتا ہے"۔ "اللہ میاں اپنی محبت (عزت) کی خاطر پاکستان کو چلا رہا ہے"۔

"ایک صاحب کہتے ہیں۔ آپس میں اجنبیت جو شہروں کا خاصہ تھی، اب دیہات میں بھی جا پہنچی ہے۔ اقتصادی پریشانیوں سے مجبور لوگ اب دوسروں کے دکھ درد بٹانے کی بجائے ایک دوسرے سے کھنچنے لگے ہیں"۔

"بچے پوچھتے ہیں ابو حالات اگلے سال تک بھی ٹھیک ہو جائیں گے کہ نہیں"۔

ایک ٹیکسی والا کہتا ہے۔ خبر نہیں یہ بھارت کو گلی ڈنڈے کی چیٹ کون لگا گیا ہے۔ اس وقت تو جنگ سے اور گڑبڑ ہو جائے گی"۔

"ایک صاحب نے کہا۔ میرے بھائی فوج میں کیپٹن ہیں۔ وہ کسی محاذ پر چلے گئے ہیں۔ پچھلی جنگ میں ایک بھائی لیفٹیننٹ تھا، وہ شہید ہو گیا، لیکن ملک اور قوم کو کیا فائدہ ہوا، یوں لگتا ہے۔ جیسے ہم کسانوں اور مزدوروں کے بیٹے کیپٹن اور میجر، اس لئے اپنے خون کا نذرانہ دیتے ہیں کہ لیڈر اور سیٹھ کی دھن (دولت) اور عیاشی قائم رہے۔ اس وقت بھی ان کی عیاشی کا یہی عالم تھا۔ اب بھی یہی عالم ہے۔ کیا ہمارے بیٹے صرف ان کی رنگ رلیوں کے تحفظ کے لئے جان دیتے ہیں"۔

آج کل مجھے اپنے ارد گرد یہ آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ دل خون کے آنسو روتا ہے، بعض لوگ اب ان سیاستدانوں کے نام بھی عقیدت سے لینے لگے ہیں، جنہوں نے قیام پاکستان کی مخالفت کی تھی، ۲۳ برس ہم پر مسلط رہنے والوں نے جو غلطیاں کی ہیں، ان کے اثرات میں اب بعض لوگ یہ بھی سوچنے لگے ہیں کہ برصغیر کی تقسیم غلط ہوئی تھی۔

یہ سب کچھ کیا ہے، یہ ناقابل معافی اغلاط کا ورثہ ہے جو میری نسل کو ملا ہے۔ آج تک ہم پر جو لوگ بھی مسلط رہے ہیں انہوں نے حالات کو اس نوبت تک پہنچا دیا ہے۔ کہ لوگ اس کے وجود کے بارے میں بھی وہم میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ ایک قوم کے لئے اس سے زیادہ خطرناک صورت حال اور کیا ہو سکتی ہے۔

اس وقت حالات یہ ہیں کہ گذشتہ ہفتے صدر مملکت نے اپنی نشری تقریر کے تین چوتھائی حصے میں بھارت کی طرف سے جارحیت اور جنگ کے خطرات کا اور ایک تہائی سے کم میں اپنے انتقال اقتدار کے منصوبے کا ذکر کیا ہے۔ لیکن اب جو فضا ہے، اس میں جنگ جنگ کا شور سنا جا رہا ہے، انتقال اقتدار یا بحالیٔ جمہوریت کی بات صرف مسٹر بھٹو کر رہے ہیں۔ انہوں نے یہ بھی کہہ دیا ہے کہ جنگ کا کوئی خطرہ نہیں ہے۔ وہ اتنا بڑا بیان کسی اعتماد کے بغیر نہیں دے سکتے ہیں۔

خیر اس سے کوئی غرض نہیں کہ جنگ ہوتی ہے۔ یا نہیں۔ انتقالِ اقتدار یا بحالیٔ جمہوریت بہرحال لازمی امر ہے یہ خیال ذہنوں میں کیوں سما گیا ہے کہ عوام کے منتخب کئے ہوئے نمائندے۔ اس وقت حالات کو نہیں سنبھال سکیں گے، جب ملک حالتِ جنگ میں ہو گا۔ ۱۹۶۵ء میں کیا منتخب حکومت (جیسی کیسی بھی تھی) کو معزول کر کے خالص فوجی حکومت لائی گئی تھی۔ برطانیہ، روس اور امریکہ نے جنگیں لڑی ہیں۔ وہاں تو منتخب حکومتیں ہی موجود تھیں۔ انہوں نے جنگ کا سامنا، جنگ کے بعد حالات کا بھی سامنا کیا۔ سرحدوں کی حفاظت تو بہرحال فوج ہی کرتی ہے۔ لیکن اندر کے انتظامی حالات تو عوامی نمائندے ہی سنبھالتے ہیں دوسری دفاعی لائن عوام ہی ہوتے ہیں۔ عوام اور فوجی حکومت کا براہ راست کوئی رابطہ نہیں ہو سکتا۔

ہم یہ باتیں اس لئے کہہ رہے ہیں کہ جنگ کا خطرہ انتقالِ اقتدار کی راہ میں رکاوٹ نہیں بن سکتا۔ اور نہ بنتا

مجیبُ الرحمٰن کو بیگناہ کہنا کیا توہینِ عدالت نہیں ہے

چاہیئے. جب مشرقی پاکستان۔ جہاں جنگ کے سے حالات ہیں وہاں سول حکومت اور وہ بھی غیر نمائندہ قائم کی جاسکتی ہے. تو پورے ملک اور مغربی پاکستان میں۔ جنگ کا خطرہ۔ عوامی حکومت کے قیام میں رکاوٹ کیوں بنے۔؟

اس وقت جو طاقتیں۔ بحالی جمہوریت کی مخالفت کر رہی ہیں۔ ان میں جماعت اسلامی پیش پیش ہے جماعت اسلامی کے عزائم کسی سے پوشیدہ نہیں ہیں، جماعت اسلامی نے تحریک پاکستان کی مخالفت کی کیونکہ وہ عوام کی تحریک تھی مشرقی پاکستان میں جماعت اسلامی ہمیشہ عوام دوست طاقتوں کی مخالف رہی ہے. جب عوامی لیگ نے الیکشن میں جیتنے کے بعد بائیں بازو کے رہنماؤں اور کارکنوں سے انتقام لینے کا منصوبہ بنایا تو جماعت اسلامی۔ عوامی لیگ کی حمایت میں نکل آئی۔ جماعت اسلامی کے مشرقی پاکستان کے امیر پروفیسر غلام اعظم۔ مجیب الرحمٰن کو اقتدار فی الفور سونپنے کا مطالبہ کرنے لگے۔ صدر مملکت نے ۲۶ مارچ کو مجیب الرحمٰن کو غدار اور عوامی لیگ کو پاکستان کے خلاف جنگ کرنے کے الزام میں ملوث ہونے پر خلاف قانون قرار دیا، مغربی پاکستان کی جماعت اسلامی نے فوراً اس اعلان کا خیر مقدم کیا، جماعت اسلامی کے اخبارات مجیب الرحمٰن کی سازش کی تاریخ بیان کرنے لگے۔ حکومت کی طرف سے عوامی لیگ کی طرف سے غیر بنگالیوں کے کشت و خون کے واقعات لکھنے پر پابندی تھی مگر جماعت اسلامی کے سرکاری ترجمان "ایشیا" اور حامی اخبارات "زندگی"، "جسارت" اور "نوائے وقت" وغیرہ یہ خونی واقعات بیان کرنے لگے. عوامی لیگ کے ارکان قومی و صوبائی اسمبلی کو غنڈے، قاتل، مجرم، ننگی اور لیٹرے کہا گیا۔ مجیب الرحمٰن کو کئی برس سے غداری کی سازشوں میں ملوث ثابت کیا گیا، لیکن مشرقی پاکستان جماعت اسلامی کے امیر پروفیسر غلام اعظم کو مغربی پاکستان جماعت اسلامی سے اس سلسلے میں اتفاق نہیں تھا۔ انہوں نے صدر مملکت سے ملاقات کے بعد چند ماہ پہلے اعلان کیا کہ مجیب الرحمٰن نہیں بلکہ مجرم بھاشانی، عطاء الرحمٰن اور پروفیسر مظفر احمد ہیں۔ اس بات کا کوئی نوٹس نہیں لیا گیا۔ اب پیپلز پارٹی کا وفد مشرقی پاکستان میں پہنچا تو پروفیسر غلام اعظم کو ہذیان کا دورہ پڑ گیا اور انہوں نے کہا کہ۔

● موجودہ واقعات مسٹر بھٹو کے پیدا کردہ ہیں۔ انہیں اپنا وفد یہاں نہیں بھیجنا چاہیئے

ایک تازہ بیان میں انہوں نے کہا ہے۔

● موجودہ واقعات کے ذمہ دار وہ ہیں جو انتخابات کی بجائے مسلح جدوجہد پر یقین رکھتے تھے۔ ان میں مولانا بھاشانی پروفیسر مظفر احمد اور مسٹر عطاء الرحمٰن ہیں۔

● دوسری ذمہ دار شخصیت مسٹر بھٹو اور ان کی پارٹی ہے اگر ان کی پارٹی ترقی پسند ہے تو انہیں اپنا وفد کلکتہ بھیجنا چاہیئے کیونکہ تمام ترقی پسند وہیں بیٹھے ہیں۔

● مجیب الرحمٰن کے بارے میں انہوں نے کہا کہ وہ ناعاقبت اندیشی کا شکار ہوئے اور کالعدم عوامی لیگ کے سربراہ نے کبھی "آزادی" کا اعلان نہیں کیا، اور نہ ایسی تحریک چلائی۔

پروفیسر غلام اعظم جب یہ ہذیانی باتیں کرتے ہیں تو ہمیں اس کے در پردہ مقاصد سمجھ میں آتے ہیں لیکن ہم تو اپنی فوجی حکومت سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ سب سے ذمہ دار شخصیت اور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر۔ اپنی تقریروں میں بار بار ایک شخص کو غدار اور پاکستان کے خلاف جنگ لڑنے کا مرتکب قرار دے چکے ہیں، عوامی لیگ پر وہ الزام لگا چکے ہیں کہ اس نے مسلح بغاوت کی لاکھوں بے گناہ افراد کو تشدد کا نشانہ بنایا۔ اس شخص پر عدالت میں مقدمہ بھی چل رہا ہے۔ ایک صاحب کھلے بندوں یہ بیانات دے رہے ہیں ان کے بیانات کا کوئی نوٹس نہیں لیا جا رہا، توہین عدالت کا ارتکاب ہو رہا ہے۔ اس پر بھی کچھ نہیں ہوتا۔ اگر ایئر مارشل اصغر خان مجیب کے بوڑھے باپ اور قریب المرگ ماں سے مل لیتے ہیں بچے کے سر پر ہاتھ پھیر دیتے ہیں تو مشرقی پاکستان میں ان کے بیانات پر پابندی عائد کر دی جاتی ہے۔ غلام اعظم بیت المکرم کی سیڑھیوں پر کھڑے ہو کر نعرہ لگاتے ہیں کہ مجیب غدار نہیں تھا۔ تو کچھ نہیں ہوتا۔

کچھ طاقتیں مشرقی پاکستان کی طرح مغربی پاکستان اور مرکز میں بھی امن کمیٹیوں کے ذریعے حکومت کرنا چاہتی ہیں

ہم پوچھتے ہیں اگر یہ سب کچھ نہیں تھا تو صدر مملکت بار بار ایسا کیوں کہتے رہے۔ اور وہ کون لوگ ہیں جو غلام اعظم جیسے لوگوں کو یہ بیانات دینے کی شہ دے رہے ہیں۔

ہمیں معلوم ہے کہ پروفیسر غلام اعظم کو یہ جرأت اس لئے ہو رہی ہے کہ الیکشن ہارنے کے باوجود مشرقی پاکستان کی کابینہ میں ان کے دو وزراء آگئے ہیں، (ii) مولانا غلام غوث ہزاروی کے بقول مشرقی پاکستان میں ایسا تاثر پھیلنے کی اجازت دی جا رہی ہے کہ میجر جنرل راؤ فرمان علی جیسے ذمہ دار لوگ جماعت اسلامی کے لئے استعمال ہو رہے ہیں (iii) جماعت اسلامی کے کارکنوں کو فوج کی تحویل میں شامل رضاکاروں کی صورت میں بھی اسلحہ مل گیا ہے اور اس کے علاوہ ان کی اپنی مسلح تنظیم "البدر" کو بھی اسلحہ مل گیا ہے۔ اب جماعت اسلامی کے پاس مسلح افراد کی بہت بڑی تعداد موجود ہے (iii) مغربی پاکستان میں بھی اقتدار نہ مل سکا، اور مشرقی پاکستان میں بغیر الیکشن جیتے اقتدار مل گیا۔ (iii) پروفیسر غلام اعظم کو یہ بیانات دینے نہیں پڑ رہے بلکہ صرف دستخط کرنے پڑ رہے ہیں (v) بیوروکریسی جس نے پہلے مجیب الرحمٰن کا سہارا لیا اب پروفیسر غلام اعظم کا مجسمہ تراش رہی ہے۔

جماعت اسلامی کا یہ زعم اپنی جگہ۔ مگر اس کی مسلح سرگرمیوں سے خود دائیں بازو کی جماعتیں بھی خوفزدہ ہیں میں نے ذاتی طور پر خواجہ خیرالدین (کونسل مسلم لیگ)، نورالامین (پی ڈی پی) اصغر خان (تحریک استقلال) ملک قاسم کنونشن لیگ کی زبانی سنا ہے کہ جماعت اسلامی کے رضاکار ان کی پارٹیوں کے کارکنوں کو ہلاک کر رہے ہیں بائیں بازو کے کارکنوں کی ہلاکت کا اعتراف خود جماعت اسلامی والے کر چکے ہیں پروفیسر غلام اعظم خود

باقی صفحہ ۴۲ پر ملاحظہ فرمائیں

سنو! آواز آ رہی ہے

دھرتی کہہ رہی ہے : میں پیاسی ہوں

برہمن زادوں کو بیچا ہوا پانی واپس لو

سامع

سنو آواز آ رہی ہے
دھرتی اداس ہے
دھرتی تصویر یاس ہے
دھرتی لب بہ فریاد ہے
میں پیاسی ہوں
میں نزار ہوں
میں سوکھ رہی ہوں
میرے دشت و دمن، میرا تن، میرا من، نخزاؤں
سے لرزیدہ ہیں
سنو! دھرتی کی آواز سنو!
دھرتی کہہ رہی ہے
مجھے پانی دو۔ مجھے پانی دو۔
مجھے نم دو۔ مجھے نم دو
میری زرخیزیوں کی خاطر
میری آبادیوں کی خاطر
میری بہاروں کی خاطر
سنو! میری سدا سہاگن دھرتی، میری کرماں والی دھرتی،
میری بھاگاں والی دھرتی۔ لب بہ دعا ہے کہ :
میرا سہاگ وہاگ رہے۔
میرے کرم کرم رہیں
میرے بھاگ بھاگ رہیں
میری آبادیاں آباد رہیں
میری بہاریں سدا بہار رہیں
کہ میری نم میں بڑی ہی زرخیزی ہے۔
میری زرخیزیوں سے میرے بیٹوں کا مکھڑا تمتمایا ہوا ہے، اجلایا ہوا ہے۔ سنولایا ہوا ہے
دھرتی کے بیٹوں کے مکھڑے سدا تمتماتے رہیں، اجلائے رہیں۔ سنولاتے رہیں، لیکن دھرتی تو پانی کے ملنے کی آس لگا بیٹھی ہے

تصویر یاس بنی بیٹھی ہے
پانی کہاں گیا۔
پانی، پانی پانی کیوں ہوگیا۔
پانی تو رواں دواں تھا
پانی تو فراواں تھا۔
پانی تو بے پایاں تھا۔
پانی تو دھرتی کے ماتھے کی مانگ کا سیندور تھا، نور تھا۔
یہ پانی کمیاب کیوں ہوگیا۔ یہ پانی پایاب کیوں ہوگیا۔
اس کی روانیوں کو کیا ہوا
سنو! خشک ہوتے دریاؤں کی آواز سنو!

۲۳ برس پہلے جب اس دھرتی کے اجارہ داروں، لنڈن اور واہ کے سامریوں نے برہمن زادوں کے ہاتھوں ہماری روانیوں کا رخ پھیرے جانے پر کوئی آواز بلند نہ کی۔ کوئی احتجاج نہ کیا —— کوئی کھراگ بھی نہ رچایا بلکہ برہمن زادوں سے ہماری روانیوں کا سودا کر لیا۔ یہ ہماری روانیوں پر غیروں کے اختیار کی پہلی کڑی تھی۔ یہ پہلی کڑی اپنوں نے ہی رکھی تھی۔ یہ بڑی ہی تلخ تھی، بڑی ہی کڑوی تھی۔ یہ کڑی بڑی ہی منحوس تھی۔ یہ حل بڑا ہی بدشگون تھا۔
یہ آج ہمارے سینے پر بہتے پانی کی کمیابیوں کا، پایابیوں کا سُراغ ہے۔ یہ لنڈن اور واہ کے سامری خوب جانتے ہیں۔
پانی سال بہ سال کم ہوگیا۔ نایاب ہوتا گیا۔
پانی اور دھرتی میں جدائی اور فاصلے بڑھتے گئے
بارہ سال بیت گئے، کڑے، کٹھن، بارہ سال
برہمن زادوں نے پانی کی روانیوں پر اپنی گرفت مضبوط سے مضبوط تر کر دی۔ اور آخری بار ایک بڑے سامری نے اپنے بدیسی "دوستوں" نہیں "آقاؤں" کی تان پر بین بجائی۔ اور پانی کی فراوانیوں کا مژدہ سنایا۔ اور یہ مژدہ جانفزا آج نوحۂ دلگداز بن گیا ہے۔ اب

دھرتی کے بیٹوں کی آنکھوں میں پانی ہے۔ دریاؤں میں پانی نہیں ہے۔ دھرتی کے سینے پر پانی نہیں ہے۔
سنو! یہ دھرتی سید علی ہجویر کا مسکن ہے۔
یہ دھرتی فرید گنج شکر کا گہوارا ہے
یہ دھرتی شاہ عبداللطیف بھٹائی کی بستی بھی ہے
یہ دھرتی عثمان سروندی لعل شہباز قلندر کا گھر بھی ہے
یہ دھرتی سلطان باہو، بلھے شاہ، وارث شاہ کے امرت گیتوں سے گونجتی ہے۔ دھرتی کے بیٹوں کے دل پر پانی ہے۔ اس دھرتی کے رنگ رنگ میں زندگی کی خوشبو، لہر لہر، رنگ رس، احساس کی سچائی، سانجھ پن، کھرا پن، اخوت و محبت کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ یہ دھرتی سب کی سانجھی مایا ہے۔ سب کا سانجھا جیون ہے۔ اس دھرتی کے خمیر میں حلاوتیں ہی حلاوتیں، شیرینیاں ہی شیرینیاں ہیں۔
لیکن سید علی ہجویر گنج بخش، فرید گنج شکر، شاہ بھٹائی، لعل شہباز قلندر، بلھے شاہ، سلطان باہو اور وارث شاہ کی دھرتی اداس ہے۔ تصویر یاس ہے۔ لب بہ فریاد ہے کہ میرے بیٹو۔ پانی کو اجارہ داریوں، مصلحتوں اور مفاد پرستیوں کی بھینٹ نہ چڑھاؤ۔ بلکہ اپنے اصل دشمن کو پہچانو، برہمن زادوں سے اپنا پانی واپس لو۔
مجھے پانی چاہیئے۔ مجھے پانی چاہیئے۔
نم چاہیے، مجھے نم چاہیے۔
میری زرخیزیوں کی خاطر
میری آبادیوں کی خاطر
میری بہاروں کی خاطر
مجھے بیٹوں کا لہو نہیں چاہیئے۔
مجھے پانی چاہیئے۔
مجھے پانی چاہیئے۔
تاکہ میرے بیٹوں کے مکھڑے سدا تمتماتے رہیں۔
سدا اجلاتے رہیں
سدا سنولاتے رہیں۔

عبدالحمید چھاپرا

کراچی کے غریب پاکستانیوں نے شہنشاہیت کا جشن منایا



کراچی کے باشعور اور جمہوریت پسند شہریوں نے ایرانی شہنشاہیت کی ڈھائی ہزار سالہ سالگرہ مختلف تقریبات منعقد کر کے منائی. کہیں مباحثے ہوئے کہیں محفل موسیقی، آرٹس کونسل آف پاکستان نے اقبال بانو کے ساتھ ایک شب منائی جس میں عمائدین شہر کی بڑی تعداد نے شرکت کی.

کراچی کے مختلف گلی کوچوں میں چراغاں کو دیکھ کر یہ گمان ہوتا تھا. کہ شاید پاکستان کے سب سے بڑے شہر کے لاکھوں باشندے جمہوری نظام سے مایوس ہو چکے ہیں. اور وہ اگر اپنے ملک میں بادشاہت نہ دیکھ سکے تو پڑوسی ملک ایران کی شہنشاہیت انہیں ایرانی عوام سے زیادہ عزیز ہے.

ایک سماجی ادارے نے جسے ایک کامیڈین ہیرو اور ایک ابھرتی ہوئی ہیروین کی سرپرستی حاصل ہے۔ ۱۵ اور ۱۶ اکتوبر ۱۹۷۱ء کی درمیانی شب کو مڈوے ہاؤس میں بانقاب (ماسک) رقص منعقد کر کے منایا. نو دولتیوں کے نوجوان لڑکے، لڑکیوں، تاجروں، صنعت کاروں، سماجی کارکنوں اور سیاسی رہنماؤں نے اس رقص میں شرکت کی، مڈوے ہاؤس (جو پاکستان انٹرنیشنل ایر لائنز اور کے ایل ایم کے مشترکہ انتظام کے تحت چل رہا ہے) میں رات کے نو بجے کے بعد راجہ اندر کے دربار کا سماں تھا۔

مغربی دھنوں پر پاکستانی اور بیرونی نیم برہنہ جسم، فوکس ٹراٹ، چاچاچا، راک اینڈ رول اور شیک ناچ رہے تھے. ماسک والے رقص میں بعض لوگوں نے بغیر نقاب کے شرکت کی.

رات بھر بتیاں جلتی رہیں، بتیاں بجھتی رہیں، جوڑے آتے رہے، جوڑے جاتے رہے، کاریں آتی رہیں کاریں جاتی رہیں، مڈوے ہاؤس کے کمرے کھلتے رہے. کمرے بند ہوتے رہے اور اس طرح ایرانی شہنشاہیت کی ڈھائی ہزار سالہ سالگرہ شاندار طریقے سے منائی گئی.



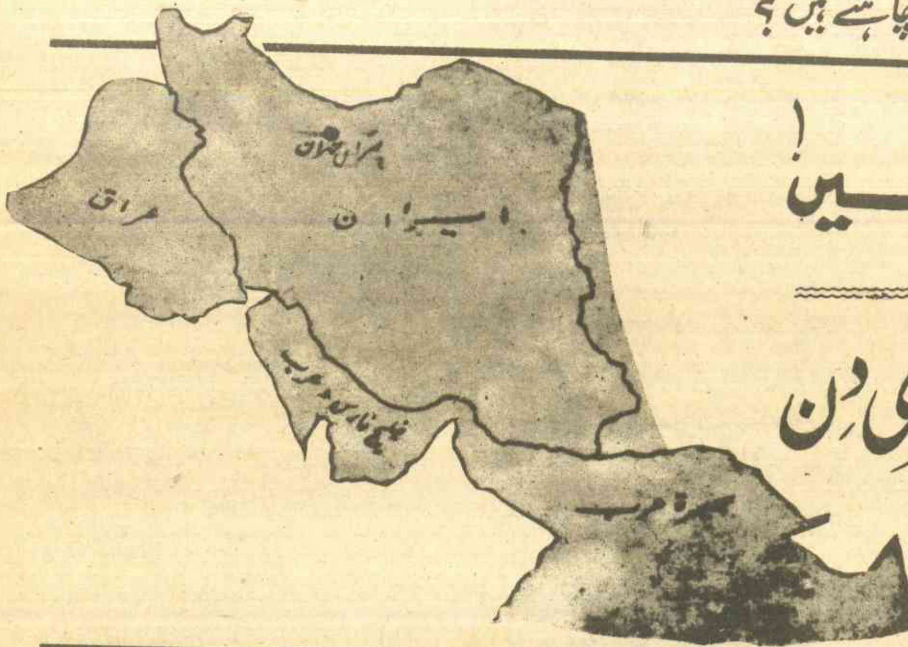
ٹیلی ویژن کراچی کے ایک پروڈیوسر — اور
پاکستانی قوم کی ایک برہنہ کمر لڑکی

جشن پر
ایک نظم

محمود شام

میں ریزہ ریزہ ہوں
میرا ہی حشر برپا ہے
جہاں میں چاروں طرف میری کرچیاں بکھریں
میں چاہتا ہوں کہ ان کو سمیٹ لوں —— لیکن
ہوا میں زہر گھلا ہے
گراں گراں ہے گھٹن
یہ رنگ رنگ دریچے، یہ پھول پھول مکاں
یہ کیسا جشن مناتے ہیں میرے شہر کے لوگ
مرے بکھرنے کا یا اپنے ٹوٹ جانے کا
ہر ایک سمت چمکتی ہیں کرچیاں اپنی
تمام قمقمے روشن ہیں اپنے ریزوں سے
مرے بکھرنے کا یہ جشن ہے —— مبارکباد

ایران کے عوام کیا چاہتے ہیں؟



خلیج فارس میں

سامراج کے آخری دن

نمائندہ الفتح

"امریکہ اور برطانیہ نہایت دانشوری سے ایران کو بھاری تعداد میں جدید ترین جنگی ہتھیار فراہم کررہے ہیں" یہ انکشاف نیویارک ٹائمز نے ۲۵ جولائی ۱۹۷۱ء کو کیا اخبار لکھتا ہے کہ امریکی، یورپی اور جاپانی صنعتوں کی بقاء اور ترقی کا دارومدار خلیج فارس و عرب کے تیل پر ہے اس علاقے کی تمام آئل کمپنیاں امریکہ، یورپ اور جاپان کی ہیں، ۱۹۷۱ء کے آخر تک خلیج فارس و عرب سے برطانوی افواج کے اخراج کے فیصلے اور یہاں سے برطانوی مسلح بیڑے کی واپسی سے سامراجی مفادات کو اس علاقے میں عوام دوست، محب وطن طاقتوں سے شدید خطرہ ہے چنانچہ اپنے مفادات کے تحفظ کے لئے امریکہ اور برطانیہ، ایران کو استعمال کررہے ہیں، رپورٹ کے مطابق امریکہ آواز سے تیز پرواز کرنے والے جدید ترین دو سو فینٹم لڑاکا بمبار طیارے ایران کو فروخت کررہا ہے جبکہ ایران کے پاس ایف ۸۶ اور ایف ۴ کے لڑاکا طیاروں کی ایک بھاری تعداد موجود ہے، لڑاکا بمبار طیاروں کے علاوہ بھاری تعداد میں مسلح ہیلی کاپٹر ان ہیلی کاپٹروں کو امریکی سامراج نے بہت وسیع پیمانے پر ویت ناميوں کے خلاف استعمال کیا لیکن ویت نام کے حریت پسندوں نے اپنے معمولی ہتھیاروں سے انہیں مار گرایا، ہوور کرافٹ پانی پر چلنے والا تیز رفتار جنگی جہاز، ٹینک، توپیں اور ٹرانسپورٹ ہوائی جہاز ایران کے ہاتھوں فروخت کئے جارہے ہیں اور ایرانی بحریہ کو جدید ترین بحری جہاز اور آب دوزیں بھی مہیا کی جارہی ہیں، اس اسلحہ کے استعمال کے لئے خلیج فارس و عرب کے ایرانی ساحل پر بے شمار نئے ہوائی اڈے بنائے جارہے ہیں، پرانی ایرانی بندرگاہوں کو وسیع کیا جارہا ہے اور نئی بندرگاہیں بنائی جارہی ہیں۔ "نیویارک ٹائمز" کی رپورٹ کے مطابق تہران کے جنوب میں ایک فوجی اڈے کو آٹھ سو پچاس ٹینکوں، بڑی توپوں اور طاقتور جنگی مشینوں سے لیس کیا جارہا ہے سامراجی ممالک کے آپس کے تضادات، استحصالی نظام کے خلاف بڑھتی ہوئی عوامی نفرت، اور دنیا میں سامراجی طاقتوں کے خلاف مظلوم عوام کی بڑھتی ہوئی جدوجہد آزادی کی وجہ سے سامراج اور نوآبادکاروں کے لئے یہ بہت مشکل ہوگیا ہے کہ وہ اپنے مفادات کا تحفظ خود اپنی قوت سے کرسکیں، برطانیہ عملی

لیاقت اور مصدّق

سامراجی مفادات

کے رکھوالوں کے

ہاتھوں شہید ہوئے

اب برطانیہ صغریٰ بن چکا ہے۔ اس بوڑھے شیر میں اتنی طاقت نہیں کہ وہ اپنے سامراجی مفادات کی حفاظت کرسکے، دنیا بھر کے عوام اسے دھتکار رہے ہیں اور اپنے وطن سے دھکیل کر اسے واپس جزائر برطانیہ میں بھیج رہے ہیں۔ چند سال قبل جنوبی یمن کے عوام نے قومی محاذ آزادی کی قیادت میں جنوبی یمن اور عدن سے برطانوی فوجوں کو نکال دیا اور اب وہ اس علاقے کی رجعت پسند حکومتوں اور سامراج کے حاشیہ برداروں کے خلاف جدوجہد کررہے ہیں۔ عوام مسلح جدوجہد کی راہ پر گامزن ہیں، خلیج فارس و عرب کی ریاستوں میں قومی محاذ آزادی کی قیادت میں مسلح جدوجہد کامیابی کی منزلیں طے کررہی ہے۔ ذوفار، مسقط اور اومان کے بیشتر علاقوں سے حریت پسندوں نے سامراج نوازوں کو نکال باہر کیا ہے اور ایک وسیع علاقہ سامراجی اور استحصالی چنگل سے آزاد ہوچکا ہے۔ اب یہ تحریک خلیج فارس و عرب کے دوسرے علاقوں کا رُخ کررہی ہے۔ اس علاقے میں کتنے سال رجعت پسندوں کا اقتدار رہے گا؟ اس کا جواب چند برسوں میں ہی مل جائے گا۔

مسلح جدوجہد کے پیش نظر برطانیہ کے لئے یہ ممکن نہیں رہا ہے کہ وہ بزور طاقت خلیج فارس و عرب میں عوام اور معدنی وسائل کا استحصال براہ راست کرسکے۔ اس لئے برطانیہ اور امریکہ خلیج فارس کے سامراج نواز حکمرانوں کے ذریعے اپنے مفادات پورے کرنا چاہتے ہیں۔ خلیج فارس و عرب کی چھ چھوٹی چھوٹی ریاستوں کا وفاق اس سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ گو اس علاقے کی بڑی ریاستوں، بحرین، قطر اور کویت نے وفاق میں شمولیت سے انکار کردیا ہے۔ لیکن برطانیہ کے ساتھ خصوصی دفاعی معاہدے کرکے انہوں نے برطانیہ کا اصل مقصد پورا کردیا ہے۔ خلیج فارس و عرب کی چھ ریاستوں کا وفاق آپس کے تضادات کی وجہ سے فعال کردار ادا کرنے سے قاصر ہے، وہ امریکی اور برطانوی مفادات کو پورا نہیں کرسکتا، اس لئے امریکہ، برطانیہ اور جاپان اپنے مفادات کے لئے ایران کو استعمال کررہے ہیں۔

جب ڈاکٹر مصدق نوے فیصد کی اکثریت سے انتخابات

ایران میں انڈے اسرائیل سے درآمد کئے جاتے ہیں

جب مصدق وزیر اعظم بنے تو انہوں نے تمام غیر ملکی آئل کمپنیوں کو قومیانے کا اعلان کیا اس موقعہ پر رسوائے زمانہ امریکی سی آئی اے نے سامراج نواز ایرانی جرنیلوں کو خرید کر ڈاکٹر مصدق کے لائے ہوئے انقلاب کو ناکام بنا دیا۔ اور انہیں قتل کروا دیا۔ یہ اسی زمانے کا ذکر ہے۔ جب پاکستان میں سامراج کے مفادات کے رکھوالوں نے پاکستان کے پہلے وزیر اعظم خان لیاقت علی خان کو شہید کروا دیا تھا۔ ڈاکٹر مصدق کے بعد ایران مغربی ممالک کی گود میں چلا گیا۔ اسے دفاعی معاہدوں میں پھانسا گیا اور وسیع پیمانے پر اسلحہ مہیا کیا گیا، بدقسمتی سے ایران اور پاکستان کو ایک ہی سامراجی معاہدے سنٹو میں جکڑا گیا، برازیل، گوئٹے مالا اور جنوبی افریقہ کی طرح مغربی ممالک نے ایران میں بھی سرمایہ کاری کر کے ایرانی قومی سرمایہ داروں کو ابھرنے سے روک دیا اور پوری ایرانی معیشت پر مغربی سرمایہ داروں اور ان کے حلیف گماشتہ سرمایہ داروں کا قبضہ ہو گیا۔ غیر ملکی سرمایہ داروں نے بھاری صنعتوں میں سرمایہ کاری کرنے کی بجائے ایسی صنعتوں میں سرمایہ لگایا جہاں مشینوں کو صرف اسمبل کیا جاتا ہے ایران میں کاریں، ٹرک، بسیں، فرج اور گھریلو استعمال کی برقی و گیس سے چلنے والی اشیاء کے پرزے مغربی ممالک سے درآمد کئے جاتے ہیں اور انہیں یہاں اسمبل کیا جاتا ہے امریکہ اور یورپ کی بڑی بڑی اجارہ دار کمپنیوں، جنرل موٹرز، اسٹینڈرڈ آئل، برٹش پیٹرولیم کرائسلر وغیرہ نے ایرانی گماشتہ سرمایہ داروں کے اشتراک سے مشینوں کو اسمبل کرنے کے بڑے بڑے کارخانے ایران میں قائم کر رکھے ہیں جس کی وجہ سے مغربی ممالک پر انحصار اس حد تک بڑھ چکا ہے کہ روزمرہ کی اشیاء صرف بھی درآمد کی جاتی ہیں

یہ بات دلچسپی کا باعث ہو گی کہ ایران میں پولٹری فارمنگ ایسی سادہ اور آسان صنعت بھی پروان نہیں چڑھ سکی چنانچہ انڈے اسرائیل سے درآمد کئے جاتے ہیں، مکھن، ہالینڈ، ناروے، بلغاریہ اور رومانیہ سے منگوایا جاتا ہے، شہری آبادی کے لئے بھیڑ کا گوشت نیوزی لینڈ سے درآمد کیا جاتا ہے۔ گندم امریکہ آسٹریلیا اور کینیڈا سے منگوائی جاتی ہے۔ پھل جس کے متعلق عام خیال یہ ہے کہ ایران میں بکثرت ہوتا ہے، لبنان سے درآمد کیا جاتا ہے۔ اس افسوسناک صورت حال سے نپٹنے کے لئے جو اقدامات کئے جا رہے ہیں اس سے الٹا نقصان ہو رہا ہے۔ بیرونی ممالک نے گماشتہ سرمایہ داروں کے اشتراک سے ایران کے زرخیز علاقوں میں وسیع رقبہ پر زرعی فارم کھولے ہیں اور مزید کھولے جا رہے ہیں۔ ان فارموں میں مشینی زراعت کا طریقہ اپنایا گیا ہے لیکن ان مشینوں سے بھرپور فائدہ نہیں اٹھایا جاتا جس کی وجہ سے پیداوار مسلسل کم ہو رہی ہے۔

ایران کو تیل کے ٹیکس سے جو آمدنی ہوتی ہے وہ ساری تو نہیں لیکن اس کا ایک بہت بڑا حصہ درآمدات پر خرچ ہو جاتا ہے اور جو اشیاء درآمد کی جاتی ہیں۔ وہ ایسی ہوتی ہیں کہ مغربی ممالک پر انحصار کم ہونے کی بجائے بڑھتا جاتا ہے اس وقت ایران کو مغربی ممالک نے مشرق وسطیٰ کے علاوہ افریقہ اور ایشیا میں اپنی مصنوعات فروخت کرنے کا اڈہ بنا لیا ہے۔ امریکی، یورپی، جاپانی کمپنیوں کے علاوہ سوویت یونین اور مشرقی یورپ کے ممالک نے بھی ایران میں اپنی کمپنیاں قائم کر دی ہیں، مغربی ممالک کا بنا ہوا لیکن ایران کا اسمبل کردہ سامان مشرق وسطیٰ کے علاوہ مشرقی یورپی ممالک کو برآمد کیا جاتا ہے حال ہی میں امریکی کمپنی کرائسلر کی بنائی ہوئی لیکن ایران کی اسمبل کردہ کئی سو بسیں رومانیہ کی گئیں، ایران کے اسمبل کئے ہوئے فرج اور گھریلو استعمال کی بجلی اور گیس سے چلنے مصنوعات بلغاریہ کو برآمد کی جاتی ہیں۔ اس طرح مغربی ممالک اپنی مصنوعات ایران کی وساطت سے ان ممالک کو برآمد کرنے میں کامیاب ہو گئے جہاں ان کا براہ راست داخلہ ناممکن ہے۔

تہران یونیورسٹی اور تہران پولی ٹیکنیک ایک برس سے بند ہیں

مندرجہ بالا سطور سے ثابت ہوتا ہے کہ ایران میں مغربی ممالک کے مفادات اعلیٰ پیمانے پر فروغ پا رہے ہیں۔ ایران کے گماشتہ سرمایہ داران مفادات کی رکھوالی کر رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مغربی ممالک کے نمائندے اور ادارے مثلاً عالمی بنک وغیرہ اکثر ایران کی ترقی کو نمونہ کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ یادش بخیر! ایوب خاں کے "دس سالہ دور ترقی" میں بھی مغربی ممالک اور عالمی ادارے پاکستان کو ایشیا کے ترقی پذیر ملکوں میں امتیازی مقام دیا کرتے تھے، شکر ہے کہ اب پاکستان اُن کی اُس فہرست سے نکل چکا ہے، جس میں تائیوان، جنوبی کوریا، برازیل وغیرہ ایسے سامراج نواز ممالک شامل ہیں۔

ایرانی عوام، مغربی ممالک کے بڑھتے ہوئے اثرات اور ایرانی گماشتہ سرمایہ داروں سے سخت نالاں ہیں شاہ ایران نے "سفید انقلاب" برپا کر کے، ایران کے طول و عرض میں تنخواہ دار مخبروں (جن کی تعداد خود حکومت کے مطابق دس لاکھ سے زائد ہے) کا جال پھیلا کر اور ذرائع ابلاغ عامہ پر کنٹرول کر کے (ایران میں صرف دو روزنامے "کیہان" اور "اطلاعات" شائع ہوتے ہیں۔ دونوں کا مقام اشاعت تہران ہے۔ یہ اخبار دوسرے شہروں میں اگلے دن ملتے ہیں) دونوں اخباروں میں خبریں اور مضامین تقریباً ایک جیسے ہوتے ہیں، حالات پر قابو پانے کی کوشش کی ہے۔ اس کے علاوہ ہر چھوٹے بڑے شہر، دیہات اور گاؤں کے اندر اور باہر جانے والی سڑکوں پر فوجی چوکیاں قائم کر دی گئی ہیں جہاں باہر سے آنے اور باہر جانے والی ہر کار، بس اور ٹرک کی تلاشی اور جانچ پڑتال کی جاتی ہے۔ ان تمام اقدامات کے باوجود حالات پر اُن کی گرفت کمزور ہوتی جا رہی ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ سالِ گذشتہ طلبہ نے ملک گیر ہڑتالیں کیں۔ حکومت نے ۵۰ سے زیادہ طلبہ، دانش وروں اور دیگر طبقوں کے افراد کو طویل عرصے (بیس سال تک) کی قید بامشقت کی سزا سنائی۔ ان لوگوں کا سب سے بڑا "جرم" یہ تھا کہ انہوں نے چین کے عظیم رہنما اور پاکستان کے عظیم محسن چیئرمین ماؤ کی تصانیف کا ترجمہ کیا تھا۔

ایران کی سب سے بڑی یونیورسٹی۔ تہران یونیورسٹی اور تہران پولی ٹیکنیک تقریباً ایک سال سے بند ہیں۔ اس کے علاوہ خود کیہان انٹرنیشنل کی رپورٹ کے مطابق ایران میں مسلح جدوجہد شروع ہو چکی ہے بحر کیسپین کے گھنے جنگلوں میں انقلابیوں نے اڈے قائم کر لئے ہیں۔ ابھی ایک ہفتہ قبل روزنامہ "ڈان" کراچی نے تہران میں انقلابیوں اور ایرانی فوج کے درمیان ایک

باقی صفحہ ۳۱ پر ملاحظہ فرمائیں

جماعت اسلامی کی مسلح سرگرمیاں

ہفت روزہ "زندگی" کے سنسنی خیز انکشافات



'فوج کو معلوم نہیں
کون محبِ وطن ہے اور کون تخریب کار'

الفتح رپورٹ

ہفت روزہ "الفتح" کی جانب سے مشرقی پاکستان میں جماعت اسلامی کی خاشسٹ اور دہشت پسند تنظیم "البدر" کے بارے میں سنسنی خیز انکشاف کے بعد یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ جماعت اسلامی مشرقی پاکستان میں بھارتی ایجنٹوں اور وطن دشمن عناصر کے خلاف مہم چلانے کے نام پر اپنے سیاسی حریفوں کو وسیع پیمانے پر قتل کر رہی ہے۔ اور اب اس کا اعتراف مختلف سیاسی جماعتوں کے لیڈروں کی جانب سے کیا جانے لگا ہے۔ مثلاً پاکستان جمہوری پارٹی کی مرکزی کمیٹی کے رکن اور قومی اسمبلی کے سابق ممبر ایم اے رشید نے ایک اخباری بیان میں مشرقی پاکستان کے گورنر ڈاکٹر مالک سے درخواست کی ہے کہ وہ تمام امن کمیٹیاں فوری طور پر توڑ دیں اور رضاکار فورس کے ماتحت کر دیں کیونکہ جماعت اسلامی کے کارکن رضاکار فورس کے بھیس میں نہ صرف اپنے سیاسی حریفوں کو پریشان کر رہے ہیں بلکہ انہیں قتل بھی کر رہے ہیں۔ مسٹر ایم اے رشید نے مزید کہا کہ مشرقی پاکستان میں آزادانہ اور غیر جانبدارانہ انتخابات کے لئے ضروری ہے کہ انتخابات سے قبل امن کمیٹیوں کو توڑ دیا جائے کیونکہ کہ امن کمیٹیوں پر جماعت اسلامی اور کنونشن مسلم لیگ کے کارکنوں نے قبضہ کر لیا ہے۔ اور جماعت اسلامی نے رضاکاروں میں اپنی جماعت کے کارکنوں کو داخل کر لیا ہے اس سلسلے میں سب سے پہلے پاکستان کونسل مسلم لیگ کے ممتاز لیڈر شفیق الاسلام نے ایک پریس کانفرنس میں شکایت کی تھی لیکن انہوں نے ساتھ ہی اخبار نویسوں سے درخواست کی تھی کہ وہ مذکورہ خبران کے حوالے سے شائع نہ کریں (اس کی وجہ ظاہر ہے۔ ان کی اخلاقی بزدلی تھی) اس کے بعد پیپلز پارٹی کے سربراہ ذوالفقار علی بھٹو نے اپنی ایک پریس کانفرنس میں اس کا ببانگ دہل اعلان کیا ہے جس سے جماعت اسلامی کے حلقوں میں کھلبلی مچ گئی اور اس کی جانب سے اس سنگین الزام کی تردید میں بیانات کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا لیکن ابھی جماعت اسلامی کے تردیدی بیانات کا سلسلہ جاری تھا کہ مشرقی پاکستان جمہوری پارٹی کے ممتاز لیڈر ایم اے شیخ نے اس کی نہ صرف تصدیق کی بلکہ جماعت اسلامی کا نام لے کر ایک احتجاجی بیان بھی داغ دیا جو مشرقی پاکستان کے تمام بنگلہ اور انگریزی اخبارات میں نمایاں طور پر شائع ہوا۔ ابھی ایم اے شیخ کے بیان کی سیاہی سوکھنے بھی نہیں پائی تھی کہ تحریک استقلال کے سربراہ سابق ایئر مارشل اصغر خان نے بھی اس الزام کی تصدیق کر دی اور اعتراف کیا کہ ان کے مشرقی پاکستان آنے کے بعد ان کی پارٹی کے لیڈروں نے ان سے اس بات کی شکایت کی ہے ایئر مارشل اصغر خان نے مشرقی پاکستان کے گورنر ڈاکٹر مالک سے اس قسم کے واقعات کی روک تھام کرنے کی درخواست کی۔

ہفت روزہ "الفتح" نے "البدر" کے بارے میں جو سنسنی خیز انکشاف کیا تھا اس کے بارے میں جماعت اسلامی اور اس کے نبل بچے ابھی تک خاموش ہیں اور انہوں نے ابھی تک اس کی تردید میں کوئی بیان نہیں دیا ہے۔ تاہم "الفتح" نے البدر کے بارے میں جو کچھ لکھا تھا اس کی تصدیق جماعت اسلامی کے نبل بچہ ہفت روزہ "زندگی" لاہور نے بھی کر دی ہے۔ چنانچہ ہفت روزہ "زندگی" لاہور (مطبوعہ ۱۱ تا ۱۷ اکتوبر ۱۹۷۱) میں اسلامی جمعیت طلبہ کے ۲۰ واں سالانہ اجتماع کی سجاد میر کی تحریر کردہ ایک تفصیلی رپورٹ شائع ہوئی ہے جس میں "البدر" کے کمانڈر محمد اشرف رسا کن میمن سنگھ کی زبانی "البدر" کے بارے میں کئی دلچسپ اور اہم باتوں کا انکشاف کروایا گیا ہے۔ سجاد میر نے کمانڈر محمد اشرف سے دریافت کیا کہ "آپ کو رضاکاروں سے الگ ہو کر منظم ہونے کی ضرورت کیوں پیش آئی" اس کے جواب میں محمد اشرف کہا کہ "دراصل رضاکاروں میں صرف طالب علم ہی نہیں دوسرے شہری بھی شامل ہیں ہم الگ

’عوام پولیس اور رینجرز سے نفرت کرتے ہیں‘

رہ کر کام کرنا چاہتے ہیں۔ ہم ان لوگوں میں خود کو مدغم نہیں کر سکتے پھر سیاسی جماعتوں نے اپنی طاقت ظاہر کرنے کے لئے ان تنظیموں میں زیادہ سے زیادہ آدمی داخل کئے اس بہانے تخریب پسند عناصر ان میں گھس آئے ہم ان کے جرائم کو اپنے ذمے لینا نہیں چاہتے تھے دوسری بات یہ کہ رضاکار تنظیمیں پولیس اور رینجرز کی ماتحتی میں کام کرتی ہیں اور پولیس اور رینجرز میں زیادہ تر افراد مغربی پاکستان سے بھیجے گئے ہیں نتیجہ یہ ہوا کہ ان لوگوں کی بھی کافی تعداد وہاں پہنچ گئی جن کی ہمدردیاں مغربی پاکستان کی ان سیاسی جماعتوں سے ہیں جو مغربی پاکستان کے محب وطن عناصر کی دشمن ہیں ان کا رویہ بھی ظاہر ہے اور اسی قیادت میں ہمارا کام نہ کر سکنا واضح ہے۔ . . ہمیں بارہ دن کی تربیت دی جاتی ہے اور پھر ہم میدان عمل میں آجاتے ہیں۔ اس وقت صورت حال یہ ہے کہ شہروں میں حالات معمول پر ہیں مگر تخریب کار دیہاتوں میں جا چھپے ہیں فوج ان کو نہیں پہچانتی بلکہ ان کے لئے یہاں کے یہ رستے بھی نئے ہیں۔ ہمیں علم ہے کہ کون محب وطن ہے اور کون تخریب کار“ سجاد میر نے ان سے پوچھا ”عوام کا ”البدر“ کے بارے میں کیا رویہ ہے“؟ اس کے جواب میں محمد اشرف نے کہا ”صاحب وہ تو اب تمنائیں کرنے لگے ہیں کہ پولیس اور رینجرز کو واپس بلا کر ”البدر“ کو ان کی جگہ بھیج دیا جائے جہاں جہاں انتظام ہمارے سپرد ہے دوسرے اسے رشک کے جذبات سے دیکھتے ہیں پچھلے دنوں جنرل نیازی نے میمن سنگھ کا دورہ کیا تو ہماری کارکردگی کی بے پناہ تعریف کی“۔

میں نے زندگی سے اتنا طویل اقتباس صرف اس لئے دیا تاکہ قارئین ”الفتح“ کو معلوم ہو جائے کہ جماعت اسلامی کے لوگ ”البدر“ کے بارے میں کیا کہتے ہیں ”البدر“ کے کمانڈر محمد اشرف کے بیان سے پہلی بار کئی نئی باتوں کا انکشاف (اور ساتھ ہی اعتراف) ہوا ہے مثلاً یہ کہ (۱) رضاکار فورس میں (جو حکام اور امن کمیٹی کی نگرانی میں قائم ہوتی ہے) تخریب پسند عناصر گھس آئے ہیں یعنی تخریب پسند عناصر حکومت کی جانب سے بھارتی ایجنٹوں، علیحدگی پسندوں، تخریب کاروں اور وطن دشمنوں کا صفایا کر رہے ہیں (واہ واہ! کیا خوب انکشاف ہے!) اس سے پہلے کسی نے یہ زبردست انکشاف نہیں کیا!!! (۲) کنونشن مسلم لیگ کے سربراہ فضل القادر چودھری اور مشرقی پاکستان کونسل مسلم لیگ کے صدر خواجہ خیرالدین کے بیان کے مطابق امن کمیٹی میں تمام محب وطن جماعتوں کے کارکنان شامل ہیں جو محب وطن کارکنوں اور شہریوں کو رضاکار فورس میں شامل کرتے ہیں۔ لیکن جماعت اسلامی کے کارکن محمد اشرف کے بیان کے مطابق اس میں تخریب پسند عناصر گھس آئے ہیں اس لئے وہ ”ان کے جرائم کو اپنے ذمے لینا نہیں چاہتے ہیں“ یعنی محمد اشرف یہ تسلیم کرتے ہیں کہ رضاکار فورس کے اراکین (خواہ اس کی کوئی بھی تاویل پیش کی جائے) جرائم کر رہے ہیں (۳) محمد اشرف کو یہ بات سخت ناپسند ہے کہ رضاکار تنظیمیں پولیس اور رینجرز کی ماتحتی میں کام کرتی ہیں اور پولیس اور رینجرز میں زیادہ افراد مغربی پاکستان سے بھیجے گئے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان میں ان لوگوں کی بھی کافی تعداد وہاں پہنچ گئی جن کی ہمدردیاں مغربی پاکستان کی ان سیاسی جماعتوں سے ہیں جو مغربی پاکستان کے محب وطن عناصر کی دشمن ہیں“ یعنی محمد اشرف اور جماعت اسلامی یہ کہنا چاہتی ہے کہ پولیس اور رینجرز سیاسی پارٹیوں کے اراکین ہیں اور وہ مشرقی پاکستان میں شرپسندوں اور وطن دشمنوں کا سر کچلنے کے بجائے جماعتی سیاست کرنے گئے ہیں۔ جماعت اسلامی کے اس اہم سیاسی کارکن اور فوجی تنظیم کے کمانڈر نے پولیس اور رینجرز کی ملک و وطن سے وفاداری کے بارے میں عوام کے دل و دماغ میں شکوک و شبہات پیدا کرنے اور اس طرح مارشل لاء کے ضابطے کی صریح خلاف ورزی کرنے کی کوشش کی ہے اور پولیس اور رینجرز کو ایک سیاسی فریق قرار دیا ہے۔ ”البدر“ کے اس کمانڈر نے اپنے بیان میں اشارۃً پیپلز پارٹی اور دوسری ترقی پسند سیاسی جماعتوں پر بھی چھینٹے اڑانے کی کوشش کی ہے۔ لیکن ہم فی الحال اس سے بحث کرنا نہیں چاہتے ہم صرف جماعت اسلامی کے اس ترجمان کے بیان کا آپریشن کرنا چاہتے ہیں۔ محمد اشرف نے درست کہا ہے کہ ”اس قیادت میں ان کا کام کرنا بہت مشکل ہے کیونکہ مختلف سیاسی جماعتوں کی موجودگی میں جماعت کے کارکنوں کو من مانی کرنے اور قتل عام کرنے کی اجازت ملنی مشکل تھی“۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ جماعت اسلامی نے ”البدر“ کے نام سے اپنی فوجی تنظیم اس وقت بنائی جب کہ مختلف سیاسی جماعتوں اور حلقوں کی جانب سے رضاکار فورس پر اعتراض کیا گیا کہ مسلم لیگ اور جماعت اسلامی کے کارکن اپنے سیاسی حریفوں کو میدان سے ہٹانے کے لئے انہیں ملک دشمن اور بھارتی ایجنٹ کہہ کر ہلاک کر رہے ہیں۔ ان اعتراضات کی وجہ سے حکام نے جماعت کے کارکنوں کی کڑی نگرانی شروع کر دی۔ جس کی وجہ سے انہیں کھل کر کھیلنے کا موقع نہیں ملا۔ اور انہوں نے ”البدر“ کے نام سے الگ نیم فوجی تنظیم بنا لی۔ جماعت اسلامی کے کارکن اپنے حریفوں کو کس طرح قتل کرتے ہیں۔ اس کا اندازہ کمانڈر محمد اشرف کی زبان سے سنیئے۔ محمد اشرف کہتے ہیں ”فوج ان کو نہیں پہچانتی۔ بلکہ اُن کے لئے دیہاتوں کے یہ رستے بھی نئے ہیں۔ ہمیں علم ہے کون محب وطن ہے اور کون تخریب کار“۔ یعنی حب الوطنی اور قوم پرستی کا سرٹیفکیٹ جماعت اسلامی کے کارکن فراہم کرتے ہیں۔ یعنی وہ جسے محب وطن قرار دیتے ہیں، وہ محب وطن ہے۔ اور جسے وہ قوم دشمن قرار دیتے ہیں وہ قوم دشمن! اگر محمد اشرف کا یہ بیان سو فی صد درست ہے تو سمجھ لینا چاہیئے کہ مشرقی پاکستان میں خصوصاً جماعت اسلامی کی نظروں میں وطن پرستی کا معیار کیا ہے۔ کیا ان شواہد اور دلائل کے بعد بھی جماعت اسلامی کے جرائم سے انکار ممکن ہے۔

ہم آخر میں صرف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ رضاکار فورس کے ہوتے ہوئے ایک الگ نیم فوجی تنظیم ”البدر“ کے قیام کی کس طرح اجازت دی گئی۔ خصوصاً ایسی حالت میں جب کہ مارشل لاء کے تحت مشرقی پاکستان کے خصوصی پس منظر میں کسی سیاسی یا نیم فوجی تنظیم کا قیام غیر قانونی ہے۔ ”البدر“ کے نام سے جب تنظیم قائم ہوئی ہے تو ظاہر ہے اس کے پاس اسلحہ بھی ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ اسلحہ کس طرح اور کہاں سے حاصل ہوا یا فراہم کیا گیا؟ سیاسی حلقوں کی جانب سے سوال کیا جا رہا ہے کہ اگر دوسری سیاسی جماعتوں نے وطن دشمنوں کو کچلنے کے لئے اپنی الگ تنظیم قائم کی تو کیا اُسے بھی آسانی سے اسلحہ رکھنے کی اجازت دے دی جائے گی؟

۲۲ خاندان

سرمایہ قوم کا — منافع باوانی کی جیب میں

الفتح رپورٹ

پاکستان کے بڑے سرمایہ داروں میں باوانی آٹھویں نمبر پر آتا ہے. آزادی سے پہلے اس گروپ کا برما میں کپڑے کا اچھا خاصہ کاروبار تھا اور پاکستان آنے کے بعد بھی انہوں نے کپڑے ہی کے کاروبار کو ترجیح دی. باوانی گروپ کا اولین کارنامہ باوانی وائلن ٹیکسٹائل مل کا قیام تھا اور یہ مل ۱۹۶۹ء میں قائم ہوئی اس کے بعد آہستہ آہستہ کپڑے کے کاروبار کے علاوہ اس گروپ نے دوسری صنعتوں میں بھی پاؤں پھیلانے شروع کر دیئے. اور اس طرح جیوٹ، پالی تھین، ریزن، کیمیکل اور چینی جیسی صنعتیں بھی ان کے دائرہ کار میں آگئیں.

باوانی گروپ کی مندرجہ ذیل چھ کمپنیاں کراچی ایکسچینج کی فہرست میں ہیں.

۱- باوانی وائلن ٹیکسٹائل ملز لمیٹڈ
۲- لطیف باوانی جیوٹ ملز لمیٹڈ
۳- احمد باوانی ٹیکسٹائل ملز لمیٹڈ
۴- باوانی شوگر ملز لمیٹڈ
۵- آر- آر ٹیکسٹائل ملز لمیٹڈ
۶- آر- آر، جیوٹ.

۱۹۶۶ء میں باوانی گروپ کا مجموعی اداشدہ سرمایہ ۵.۶۳ کروڑ تھا. لیکن (ASSETS) ۱۸.۸۶ کروڑ تک پہنچ چکے تھے باوانی گروپ کا سارا کاروبار ان کی اکلوتی ایجنسی احمد برادرز لمیٹڈ کے ذریعے ہوتا ہے یہ گروپ سیاسی اور سماجی سرگرمیوں میں بھی دلچسپی رکھتا ہے.

باوانی گروپ کی مختلف پانچ سالہ منصوبوں میں ترقی کی رفتار یہ رہی.

سال	اداشدہ سرمایہ (کروڑوں میں)
۱۹۵۵ء	-
۱۹۶۰ء	۲.۵۵
۱۹۶۵ء	۵.۶۳
۱۹۶۹ء	۶.۶۳

باوانی گروپ نے پاکستان میں اپنا کاروبار زور سے شروع کیا اور ان کی ترقی کی رفتار پہلے پانچ سالہ منصوبے میں تو تقریباً صفر تھی. لیکن دوسرے پانچسالہ منصوبہ میں باوانی گروپ کو ہوش آگیا اور وہ سرپٹ دولت کی دوڑ میں شامل ہو گئے

باوانی گروپ کے اداشدہ سرمایہ میں سال بہ سال اضافہ کی رفتار یہ رہی.

باوانی گروپ کی دو اہم ترین شخصیات عبدالماجد باوانی اور محمد امین باوانی ہیں، داؤد اور آمین گروپوں کو باوانی گروپ میں نمائندگی حاصل ہے، آر آر جیوٹ اور آر، آر ٹیکسٹائل کے علاوہ دوسری کمپنیوں میں مجموعی طور پر ۲۶ ڈائریکٹر ہیں. جن میں پندرہ تو باوانی گروپ کے اپنے خاندان کے افراد ہیں اور باقی میں سے اکثریت ان کے پرانے نمک خواروں کی ہے.

باوانی وائلن ٹیکسٹائل ملز لمیٹڈ

۱- اس مل نے ۱۹۵۲ء میں پروڈکشن شروع کی. اس میں

سال	لطیف باوانی جوٹ	احمد باوانی	باوانی انڈسٹریز	باوانی شوگر	آر، آر، ٹیکسٹائل	آر، آر، جیوٹ	ٹوٹل
۱۹۵۴	-	-	-	-	-	-	-
۱۹۵۵	-	-	-	-	-	-	-
۱۹۵۶	۱۵۰	-	-	-	-	-	۱۵۰
۱۹۵۷	۱۵۰	-	-	-	-	-	۱۵۰
۱۹۵۸	۱۵۰	-	-	-	-	-	۱۵۰
۱۹۵۹	۱۵۰	۱۰۵	-	-	-	-	۲۵۵
۱۹۶۰	۱۵۰	۱۰۵	-	-	-	-	۲۵۵
۱۹۶۱	۱۵۰	۱۰۵	۱۵۸	-	-	-	۴۱۳
۱۹۶۲	۱۵۰	۱۰۵	۱۵۸	-	-	-	۴۱۳
۱۹۶۳	۱۵۰	۱۰۵	۱۵۸	-	-	-	۴۱۳
۱۹۶۴	۱۵۰	۱۰۵	۱۵۸	-	-	-	۴۱۳
۱۹۶۵	۱۵۰	۱۰۵	۱۵۸	۱۵۰	-	-	۵۶۳
۱۹۶۶	۱۵۰	۱۰۵	۱۵۸	۱۵۰	-	-	۵۶۳
۱۹۶۷	۱۵۰	۱۰۵	۱۵۸	۱۵۰	۳۰	-	۵۹۳
۱۹۶۸	۱۵۰	۱۰۵	۱۵۸	۱۵۰	۳۰	-	۵۹۳
۱۹۶۹	۱۶۵	۱۱۰	۱۵۸	۱۵۰	۳۰	۵۰	۶۶۳

باوانی کاٹن کی تھیلیوں پر ٹیکس کی چھوٹ حاصل کر کے رہے

....۴ سپنڈل، ۸۵۰ کاٹن لومز ایک سو آرٹ سلک لومز، ۲۰ ہاوزری اور نٹنگ لومز لگائی گئیں اس کے بعد وقتاً فوقتاً اس میں توسیع کی جاتی رہی ہے اور ایک خاص بات یہ ہے کہ اس مل کی جتنی پیداوار ملکی مارکیٹ میں بیچی جاتی ہے اس کا دوگنا ایکسپورٹ کر دیا جاتا ہے اور ایکسپورٹ کے فوائد مع بونس ووچر کے کسی سے پوشیدہ نہیں ہیں۔

۲۔ لطیف باوانی جیوٹ ملز

۲۔ اس مل نے ۵۷-۱۹۵۶ء میں محدود پیمانے پر کام کرنا شروع کیا دراصل اس میں چالیس لاکھ روپے کا سرمایہ PIDC نے لگایا تھا لیکن بعد میں احمد برادرز لمیٹڈ نے یہ حصہ خرید لیا اور اس کے بعد PIDC کا یہ حق کہ وہ ڈائریکٹر مقرر کرے خود بخود چھن گیا ۱۹۶۳ء میں ایک اور یونٹ جسے یونٹ نمبر ۲ کا نام دیا گیا لگایا گیا۔ اس کے لئے برطانیہ سے ۹۴ لاکھ روپے کا قرضہ حاصل کیا گیا اس قرضہ میں سے ۶۴ لاکھ غیر ملکی کرنسی میں تھا۔ اور ۳۰ لاکھ ملکی کرنسی میں، اور اس نئے یونٹ کو ٹیکس کی جملہ بندشوں سے دسکیشن BB ۱۵ کے تحت) بالکل آزاد رکھا گیا تاکہ باوانی جلد از جلد صف اول کے سرمایہ داروں کی صف میں شامل ہو سکے۔

لطیف باوانی جیوٹ ملز

اس مل کی کئی ذیلی کمپنیاں ہیں ان میں سے ایک بیلا آرٹی فیشنگ انڈسٹریز لمیٹڈ ہے اس یونٹ نے ۶۲-۱۹۶۱ء میں کام کرنا شروع کیا اور اس کی مصنوعات میں پانی تھیلیں اور ربڑ اور کاٹن کی تھیلیاں شامل ہیں اس کمپنی نے بھی بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے کے لئے ٹیکس کی چھٹی کی درخواست دی اور کم از کم کاٹن کی تھیلیوں پر یہ رعایت حاصل کر کے ہی دم لیا۔ یہ کمپنی خوب منافع کما رہی ہے اور ۶۵-۱۹۶۴ء میں اس کے شیئرز پر ۲۰ فیصد منافع کا اعلان کیا گیا بعد میں اس کے سرمایہ میں اضافہ کرنے کی اجازت بھی حاصل کر لی گئی۔

لطیف باوانی ملز کی دوسری ذیلی کمپنی ایسٹرن کیمیکل انڈسٹریز لمیٹڈ کے نام سے کاروبار کرتی ہے۔ یہ بھی مکمل طور پر باوانی گروپ کی ملکیت ہے، ۱۹۶۵ء میں بلڈنگ مکمل ہوئی اور مشینری بھی لگ گئی اور اسی سال جزوی طور پر پروڈکشن بھی شروع کر دی گئی۔ یہ کمپنی فارمالین، یوریا فارمیلڈی ہائیڈ، یوریا فارمیلڈی ہائیڈ کمپونڈ اور پلاسٹک انڈسٹری کے لئے خام مال بناتی ہے یہ کمپنی بھی BB ۱۵ کے تحت ٹیکس سے بالکل مستثنیٰ قرار دی گئی ہے۔ ایسٹرن کیمیکل کمپنی نے ۳۱ جولائی ۱۹۶۶ء میں PICIC کے ذریعے پچاس لاکھ کا غیر ملکی قرضہ بھی حاصل کیا۔ اس کے بعد PICIC سے پھر ۳۰ لاکھ کا قرضہ لیا گیا ابھی شاید قوم کا کچھ زر مبادلہ بچا ہوا تھا اس لئے ایک بار پھر P.I.D.C.I کی وساطت سے ۶۴ لاکھ کا قرضہ غیر ملکی کرنسی میں اور ۳۰ لاکھ کا قرضہ ملکی کرنسی میں حاصل کیا گیا اس کے علاوہ کمپنی اپنے اسٹاک اور اسٹور کی بنا پر مختلف بنکوں سے بھی قرضہ لیتی رہی ہے۔ جو ۶۶-۱۹۶۵ء میں ۲۲۴ لاکھ تک جا پہنچا تھا۔ اس سے جو نتیجہ اخذ کیا جا سکتا وہ یہ ہے کہ "سرمایہ قوم کا منافع باوانی کی جیب میں"

احمد باوانی ٹیکسٹائل

یہ مل ۱۹۵۳ء میں قائم ہوئی اور ۲۵۰ لاکھ کے سرمائے سے کراچی اسٹاک ایکس چینج کی زینت بنی مل میں ۲۵۰۰۰ اسپنڈل لگائے گئے جن کی تعداد بڑھا کر بعد ازاں ۴۰۲۰۰ کر دی گئی۔ اس کے علاوہ ۳۰۰۴ لومز اور اس کے ساتھ ڈائنگ پرنٹنگ اور بلیچنگ کے یونٹ بھی نصب کئے گئے اس کمپنی کی ایکسپورٹس اس مال سے کہیں زیادہ ہیں جو یہ ملکی منڈی میں بیچتی ہے۔

باوانی شوگر ملز

یہ مل ٹہار ریلوے اسٹیشن کے قریب واقع ہے رحیم آباد بادین ریلوے لائن پر یہ کمپنی شوگر اور اس کے متعلقہ پراڈکس کا کاروبار کرتی ہے۔ PIDC.W نے اس کمپنی کی مشینری اور پلانٹ کے لئے ویسٹ جرمنی سے ۱۱.۰۵ ملین کا قرضہ حاصل کیا۔ کمپنی باوانی گروپ کی دوسری کمپنیوں کی طرح ایک لمبے عرصہ کے لئے ٹیکس سے مستثنیٰ قرار پاتی ہے۔

باوانی کے ۲۶ ڈائریکٹروں میں سے ۱۵ ڈائریکٹران کے اپنے خاندان کے افراد ہیں۔

باوانی خاندان کے افراد	ڈائریکٹرشپس کی تعداد
۱ ۔ عبدالماجد باوانی	۴
۲ ۔ محمد امین احمد باوانی	۴
۳ ۔ یحییٰ احمد باوانی	۳
۴ ۔ عبدالواحد باوانی	۲
۵ ابراہیم احمد باوانی	۱
۶ ذکریا احمد باوانی	۱

باوانی گروپ کے نمائندے داؤد، آدم جی اور امین گروپ میں بھی ڈائریکٹر ہیں۔ شروع کے چند سالوں میں باوانی گروپ نے شیئر ہولڈرز کے لئے کسی قسم کے منافع کا اعلان نہ کیا۔ ۱۹۶۲ء میں اوسطاً ۱۲ فیصد منافع شیئر ہولڈرز میں تقسیم کیا گیا ۱۹۶۷ء میں یہ صرف ۶ فیصد رہ گیا۔ باوانی گروپ نے حبیب بنک کے خاصے شیئرز خرید رکھے ہیں۔ اور اس طرح انہیں قرضہ کی بے پناہ سہولتیں میسر ہیں۔

عظیم المیہ

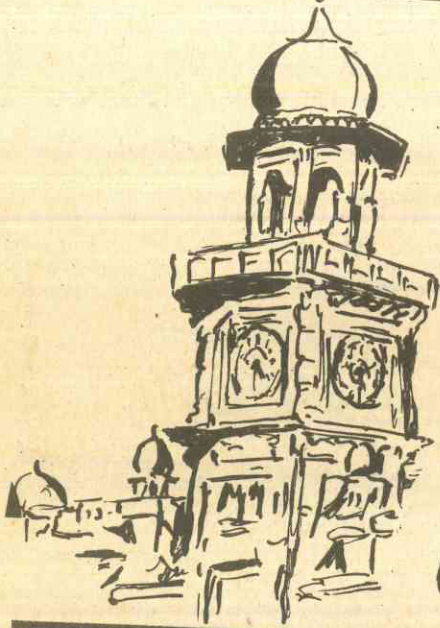
کا دوسرا ایڈیشن

پریس کی خرابی کی وجہ سے ایجنٹ حضرات اور قارئین کو تاخیر سے ملا۔ ہم نے اس مجبوری کے باوجود انتہائی کوشش کی کہ ایجنٹ حضرات اور قارئین کرام کو مطلوبہ تعداد میں یہ ایڈیشن فراہم کر سکیں تاہم ادارہ تاخیر کے لئے معذرت خواہ ہے اور قارئین اور ایجنٹ حضرات کے بھرپور تعاون کے لئے شکر گزار ہے۔

اب یہ ایڈیشن

ہر بک اسٹال سے مل سکتا ہے

جنرل منیجر ہفت روزہ "الفتح" کراچی ۲۹



جماعتِ اسلامی کے

تنخواہ دار کارکن بڑی تعداد میں داخلہ لے رہے ہیں

نمائندہ الفتح لاہور

"الفتح" میں پنجاب یونیورسٹی کا پردہ چاک ہونے کے بعد سے یونیورسٹی کے اربابِ اختیار ان دنوں خاصے پریشان اور جھلائے ہوئے ہیں۔ اس سے قبل وہ ذاتی حلقوں میں یہ دعویٰ کر چکے تھے کہ انہوں نے "الفتح" والوں کو پنجاب یونیورسٹی کے بارے میں لکھنے سے روک دیا ہے۔ لیکن سب راز طشت ازبام ہو جانے کے بعد اب وہ بائیں بازو والوں کو کوس رہے ہیں اور اپنی قانونی اور سرکاری پوزیشن محفوظ کرنے میں مصروف ہیں۔

یونیورسٹی حدود میں سیاسی جماعتوں کو اپنی سرگرمیاں کرنے کی اصولی طور پر اجازت نہیں مگر حسب معمول یہ پابندیاں صرف بائیں بازو کے لئے ہیں۔ گذشتہ دنوں اسلامی جمیعت طلباء کے لیڈر مطیع اللہ نظامی کو یونیورسٹی آڈیٹوریم میں بلوایا گیا۔ لوگوں کو جمع کرنے کے لئے بغیر اجازت د مگر انہیں اجازت کی ضرورت بھی کیا ہے! جماعت اسلامی کے کارکنوں نے یونیورسٹی نیو کیمپس میں جلوس بھی نکالا، قابل اعتراض پوسٹروں پر ایک ترقی پسند طالب علم نے اعتراض کیا تو یونیورسٹی یونین کے اسلام پسند سیکرٹری جاوید ہاشمی نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر اس طالب علم کو زدوکوب کیا۔ مطیع اللہ نظامی جو ابھی گذشتہ دنوں تک اسلامی جمیعت کے ناظم اعلیٰ تھے، نے مشرقی پاکستان کی صورت حال کے بارے میں گمراہ کن رپورٹ پیش کی، اور یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ مشرقی پاکستان میں سوشلسٹ قوتیں تخریب کر رہی ہیں اور جماعت اسلامی کے دم سے ہی پاکستان متحد ہے انہوں نے پاکستان کے اتحاد کے لیے برطانیہ اور امریکہ کی مساعی کو بھی سراہا، بنگال کی سوشلسٹ طاقتوں کے خلاف زہر اگلنے پر بہت سے طلباء احتجاجاً واک آؤٹ کر گئے اور ہال میں صرف اشاعت تعلیم کالج اور اچھرے سے بلوائے گئے کارکن رہ گئے۔ اس سلسلے میں حیرت کی بات یہ ہے کہ سوال یہ ہے کہ اس تقریب اسلامی جمیعت طلبا کے لیڈر کے لئے منعقد کرنے کی اجازت کس طرح دی گئی، جلوس کیسے نکالا گیا۔ اور کیا بائیں

شعبۂ بہبود کے طلبہ کو خواجہ غلام صادق سے نجات مل گئی

بازو کو بھی ایسی سرگرمیاں کرنے کی اجازت ہے؟

آج کل بی اے آنرز کے داخلے ہو رہے ہیں اور ان داخلوں ہی سے اندازہ ہو رہا ہے کہ رجعت پسند جماعتیں یونیورسٹی پر خصوصی توجہ دے رہی ہیں، آنرز کی کلاسوں میں جماعت اسلامی کے تنخواہ دار کارکن بڑی تعداد میں داخلے لینے کی کوشش کر رہے ہیں، ابھی ایم اے کے داخلے ہونا باقی ہیں۔ یہ ایک سوچا سمجھا منصوبہ ہے اور اس کا مقصد یونیورسٹی کی سیاست کو پورے طور پر اپنے قابو میں لینا ہے

حال ہی میں شعبہ بہبود طلبا کے ڈائریکٹر کے عہدے کا چارج یونیورسٹی کے سب سے سینئر استاد پروفیسر شبیر احمد لودھی نے سنبھال لیا ہے اور یوں خواجہ غلام صادق کا اس شعبے سے اور اس شعبے کا خواجہ غلام صادق سے پیچھا چھوٹا۔ خواجہ صاحب کا دور طلبا کے خلاف خفیہ رپورٹوں، بائیں بازو کے خلاف انتقامی کارروائیوں اور کشیدگی کا دور رہا ہے پروفیسر شبیر احمد لودھی طلبا کے تمام حلقوں میں احترام کی نظروں سے دیکھے جاتے ہیں اور ڈاکٹر کے عہدے پر تقرر ان کے لئے چیلنج ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ خود کو بدلتے ہیں یا شعبے کو، تاہم ان کی تقرری کے ساتھ ہی اسلام پسندوں کی طرف سے غیر متوقع طور پر شعبہ بہبود طلبا کے خاتمے کا مطالبہ یہ بات ظاہر کرتا ہے کہ اسلام پسندوں کو پروفیسر صاحب سے اس فرمانبرداری کی توقع نہیں جس کا ثبوت پہلے ڈائریکٹر دیتے رہے ہیں۔

یونیورسٹی اکیڈیمک اسٹاف ایسوسی ایشن پر قبضے کے لئے اسلام پسندوں کی کوششیں اس بار پھر ناکام ہو گئی ہیں۔ اس سیشن کے لئے ڈاکٹر خیرات ابن رسا صدر اور ڈاکٹر مجیب اے شیخ سیکرٹری چنے گئے ہیں، دونوں حضرات اپنے غیر متعصبانہ مزاج اور عوام دوستی کے لئے جانے پہچانے ہیں، ڈاکٹر مجیب کے خلاف تو دائیں بازو کے اخبارات خاصا کیچڑ اچھال چکے ہیں۔ دریں اثناء شعبۂ صحافت کے اسلام پسند سربراہ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید ژرنا تیواں فیم اپنے پراسرار دورے سے واپس

طالب علموں پر یونیورسٹی کی دھاندلیوں کے خلاف لکھنے پر پابندی

آچکے ہیں اس دورے کے دوران موصوف نے مشرق بعید میں سامراج کے اڈوں کا دورہ کیا اور نمائیوان کے نمائندوں کے ہمراہ متعدد میٹنگوں میں شرکت کی یہ امر قابل ذکر ہے کہ اس دورے کی چین دشمن نوعیت کا پتہ چلنے پر حکومت نے یونیورسٹی کو ہدایت کی تھی کہ موصوف کو جلد از جلد واپس بلایا جائے مگر یہ حکم نامہ رجسٹرار کی میز پر پڑا رہا معلوم ہوا ہے کہ اس سارے اسکینڈل کے باوجود ڈاکٹر عبدالسلام خورشید سے کوئی پوچھ گچھ نہیں کی گئی۔

یونیورسٹی کے شعبہ امتحانات میں شدید بدعنوانیوں اور بے قاعدگیوں کا انکشاف ہونے کے بعد ذمہ دار حکام کے خلاف کارروائی کی بجائے انتظامیہ نے اسسٹنٹ کنٹرولر کو کنٹرولر امتحانات مقرر کر دیا ہے، نئے کنٹرولر مسٹر قریشی محض بی اے ہیں اور رجسٹرار پنجاب یونیورسٹی کے فرماں بردار اور راز دار ہیں امتحانات کے سلسلے میں ہونے والی دھاندلیوں کے دوران ذمہ دار عہدے پر فائز یہ حضرت یونیورسٹی کیلنڈر میں درج کنٹرولر کے عہدے کے لئے ضروری صفات میں سے کسی کو بھی پورا نہیں کرتے، جبکہ متعدد امیدواران سے بدرجہا کوالیفائڈ تھے۔ یاد رہے کہ آج تک اس عہدے پر صرف ایم اے فائز رہے ہیں۔

گذشتہ دنوں یونیورسٹی میں سائنس، آرٹس، قانون اور کامرس کے لئے ڈینوں کے تقرر کا مقصد رفتہ رفتہ سامنے آ رہا ہے، ڈین کے عہدوں پر اسلام پسندوں اور بیورو کریٹوں کو مقرر کیا گیا ہے تین سو روپے ماہوار کی اضافی تنخواہ کے عوض ان سے یونیورسٹی کو سامراجی اڈہ بنانے کے لئے کام لیا جائے گا! ڈاکٹر افضل، خواجہ صلاح الدین، شیخ امتیاز اور غلام مرتضےٰ کا ماضی اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ یہ کام پوری تندہی سے سرانجام دیں گے۔

اکتوبر کے پہلے ہفتے میں پنجاب یونیورسٹی کی سامراج نواز انتظامیہ نے آزادیٔ اظہار رائے کا گلا کاٹنے اور اپنے بہیمانہ عزائم کی پردہ پوشی کرنے کے لیے گذشتہ دنوں تمام صدور شعبہ جات کے اجلاس میں ایک تجویز منظور کی ہے جس کے مطابق یونیورسٹی کا کوئی طالب علم یونیورسٹی میں ہونے والی دھاندلیوں کے بارے میں کسی اخبار یا رسالے میں مضمون یا کالم شائع نہ کروا سکے گا۔ اس سلسلے میں ایک پانچ رکنی کمیٹی بنا دی گئی ہے۔ جس میں سامراج نواز شیخ امتیاز پرنسپل لاء کالج، یونیورسٹی میں مبینہ طور پر ۲ لاکھ روپے کے غبن کے ملزم سابق خازن اور موجودہ رجسٹرار سید شمشاد حیدر اور جانے پہچانے امریکی سی آئی اے کے ایجنٹ ڈاکٹر افضل صدر شعبۂ علم انتظامیات شامل ہیں۔

اس تجویز کو بظاہر عمومی شکل دی گئی ہے۔ لیکن موجودہ صورت میں جبکہ یہ سیاہ ترین اصول وضع کرنے کی حاجت محسوس کی گئی ہے یہ اصول عمومی نہیں بلکہ صرف عوام دوست طلباء کے لئے وضع کیا گیا ہے۔

یونیورسٹی کا رجسٹرار

وائس چانسلر سے زیادہ با اختیار ہے

پنجاب یونیورسٹی کے سیاہ و سفید کے مالک اور نیو کیمپس فنڈ میں لاکھوں روپے کے مبینہ غبن کے دوران طویل رخصت پر جانے والے اہم ملزم سید شمشاد حیدر رجسٹرار پنجاب یونیورسٹی سالہا سال تک بڑی کامیابی اور رازداری کے ساتھ بدعنوانیوں کے ارتکاب اور سرپرستی کرنے کے بعد اب آہستہ آہستہ بے نقاب ہو رہے ہیں۔ "الفتح" کے گذشتہ شمارے میں موصوف کے بارے میں چونکا دینے والے انکشافات کے بعد متعدد افراد نے خفیہ طور پر رابطہ قائم کر کے مزید حقائق فراہم کرنے کی پیش کش کی ہے ان افراد کا کہنا ہے کہ وہ یہ سمجھ کر چپ تھے کہ شاید شمشاد حیدر اس قدر طاقتور ہیں کہ اس کے خلاف کچھ کہنا یا چھاپنا ناممکن ہے مگر اب جبکہ مہر ٹوٹی ہے تو ملک کی اس قدیم اور عظیم درس گاہ کے اعلیٰ عہدے پر فائز اس شخص کی حرکتوں سے خود بخود پردہ اٹھتا جا رہا ہے۔

معلوم ہوا ہے کہ سید شمشاد حیدر آج سے چند برس قبل بھاٹی گیٹ سے سائیکل پر دفتر آتے تھے اور آج ان کے ہر بیٹے کے پاس ایک کار ہے۔ اور کیمپس میں سرکاری رہائش گاہ کے علاوہ گلبرگ میں ان کی عالی شان کوٹھی کرائے پر چڑھی ہوئی ہے ان کا اثاثہ حسابی صورت میں بڑھ رہا ہے۔ شاہ صاحب اپنے بیٹے کے نام پر ایک کلینک بھی تعمیر کر رہے ہیں نیو کیمپس کے گرد و نواح میں موصوف نے زمین کا وسیع رقبہ خرید لیا ہے جس پر وہ اپنے نام سے کالونی بنانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ علاوہ ازیں گذشتہ کئی برس سے کیمپس کی زمین کوڑیوں کے مول کاشت کے لئے دی جاتی رہی ہے اور ٹھیکے پر لینے والے سید شمشاد حیدر کے اپنے آدمی ہوتے ہیں۔

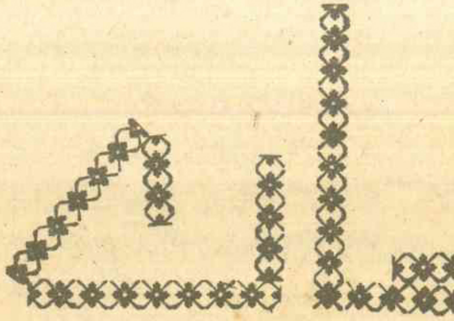
سید شمشاد حیدر کی اقرباپروری کا یہ عالم ہے۔ کہ انہوں نے اپنے ایک برادر نسبتی کو جو میٹرک بھی پاس نہیں کر سکا خواجہ صلاح الدین کے شعبہ کیمیکل انجینئرنگ میں چیف ٹیکنیشن کی حیثیت سے ملازم کروا رکھا ہے اسے تقریباً ۵۰۰ روپے تنخواہ ملتی ہے اور کیمپس میں پروفیسروں کے ساتھ رہائشی کوٹھی ملی ہوئی ہے ان صاحب کا ایک برادر نسبتی اکاؤنٹس برانچ میں چپڑاسی کے طور پر تنخواہ لیتا ہے مگر وہ اصل دفتر کی بجائے شمشاد حیدر کی بھینس کے لئے گھاس کاٹتا اور دودھ دوہتا ہے۔

نیو کیمپس کیفے ٹیریا میں پچاس ہزار روپے کے مبینہ غبن کے ملزم سابق منیجر ریاض حسین کا مقدمہ مارشل لاء سے دیوانی عدالت میں منتقل کر دیا گیا ہے ریاض حسین نے رجسٹرار اور دوسرے یونیورسٹی حکام پر سنگین الزامات عائد کئے ہیں جن کو یونیورسٹی چھپانے کی کوشش کر رہی ہے

شمشاد حیدر نے اپنی مدت ملازمت میں توسیع کے لئے ذاتی کوششوں سے یونیورسٹی کے انتظامی افسروں کی ریٹائرمنٹ کی عمر ۶۰ سال کروائی ہے۔ جبکہ تمام سرکاری محکموں میں یہ حد ۵۵ سال کی ہے یونیورسٹی کے افسروں سے یہ رعایت شاہ صاحب کے لئے خصوصی رعایت ہے

دریں اثناء نیو کیمپس فنڈ کے مبینہ غبن کی از سر نو تحقیقات کے لئے سیکرٹری مواصلات کی سربراہی میں جو کمیٹی قائم کی گئی تھی، تمام تر اطلاعات کے باوجود غبن کی ذمہ داری کسی پر ڈالنے کی ہمت نہیں پا رہی۔ معلوم ہوا ہے کہ مسٹر ایم ڈی قریشی کی گذشتہ رپورٹ میں بے قاعدگیوں کے اعتراف کا دستاویزی ثبوت مل گیا مگر تحقیقاتی افسر اس دور کے خازن اور موجودہ رجسٹرار سید شمشاد حیدر کے سامنے بے بس ہیں یاد رہے کہ وائس چانسلر علامہ علاؤ الدین صدیقی صحافیوں سے کئی مرتبہ وعدہ کر چکے ہیں کہ غبن کی تحقیقات منظر عام پر لائی جائیں گی مگر ہر مرتبہ وہ اپنے سے کہیں زیادہ با اختیار اور با رسوخ رجسٹرار سے دب جاتے ہیں۔

شمشاد احمد



دسمبر کی ایک سرد شام کمزور زرد دھوپ مٹی کی منڈیروں کو الوداعی بوسے دے رہی تھی۔ گلی میں آمدورفت بہت کم ہو چکی تھی مگر بدرو کے پل پر نذیرے کے خوانچے کے پاس دو چار آدمی گرم گرم بھنی ہوئی مونگ پھلی کھاتے ہوئے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ بچے پورے قصبے کی گلیوں میں گھوم پھر کر گنے کے خشک چھلکے جمع کر چکے تھے پل کے قریب ان چھلکوں کا ایک بہت بڑا ڈھیر لگ چکا تھا۔ نذیرا خوانچہ والے اپنی بھینگی آنکھوں سے پل کے آس پاس کھڑے بچوں کو گھور رہا تھا۔

جوں ہی شہابو رحمت کے تندور سے ایک دہکتا ہوا کوئلہ اُپلے پر رکھے نمودار ہوا، بچوں کے چہرے پر رونق آ گئی چند ایک تو جھوم جھوم کر تالیاں بجانے لگے ایک موٹے تازے صحت مند لڑکے نے جوش میں آ کر ایک نسبتاً کمزور لڑکے کو پکڑ کر ہوا میں اچھال دیا اور پھر اسے گرنے سے پہلے ہی سہارا دے کر کھڑا کر دیا۔

شہابو نے تھوڑے سے چھلکے اٹھا کر ایک طرف رکھے۔ دہکتے ہوئے کوئلے کی سطح پر جمتی ہوئی راکھ کو ایک زوردار پھونک سے اڑایا اور پھر اس کے اوپر چھلکے ڈال کر پھونک پہ پھونک مارنے لگے، ہلکے سے دھوئیں کی ایک بل کھاتی لہر اٹھی۔ پھر یہ لہر دودھیا رنگ کی ہو گئی دھواں اور دبیز ہونے لگا۔ پھر ایک ننھے سے شعلے نے جنم لیا اور دیکھتے ہی دیکھتے آگ جوان ہو گئی۔ آس پاس کھڑے بچوں کے چہرے ناچتے شعلوں کی سرخی سے اور بھی سرخ ہو گئے۔

یہ کھیل اس وقت تک جاری رہا جب تک کہ چھلکوں کا آخری تنکا بھی آگ کی نذر ہو گیا۔ اس دوران اندھیرا خاصا بڑھ چکا تھا۔ اب آگ بجھنے پہ احساس ہوا۔ اکا دکا لڑکے کھسکنے لگے۔ وہ جانا نہیں چاہتے تھے لیکن اپنے والدین کے حکم سے مجبور تھے۔ کچھ کو تو گھر سے لوگ بلانے آ پہنچے اور دیکھتے ہی دیکھتے بدرو کا پل اجڑنے لگا آگ بجھنے کے پندرہ منٹ بعد وہاں صرف شہابو اور نذیرا خوانچے والا رہ گئے سردی سے ٹھٹھرتے ہوئے شہابو نے کنکھیوں سے اونگھتے ہوئے نذیرے کی طرف دیکھا اور پھرتی سے ایک مٹھی مونگ پھلی اٹھائی اور دوسری طرف چل دیا۔

نذیرا ہڑبڑا کر اٹھا اس نے چند قدموں پر شہابو کو جاتے ہوئے دیکھا اس کی بھینگی آنکھیں اور سست دماغ یک لخت روشن ہو گئے اس نے ایک ہی جست میں شہابو کو جا لیا اور اسے قمیض کے پھٹے ہوئے کالر سے پکڑ کر جھنجھوڑا

"حرامی کی اولاد پھر وہی کام۔ نکال کیا اٹھایا ہے"

شہابو نے خاموشی سے مونگ پھلی والی مٹھی اس کی طرف بڑھا دی۔ نذیرے نے کھا جانے والی نظروں سے اسے گھورا پھر مونگ پھلی جھپٹ لی اور ایک زناٹے دار تھپڑ اس کی گردن پہ جمایا اور واپس آ کر بڑبڑاتا ہوا پھر اونگھنے لگا۔

شہابو کے دماغ میں ایک ساتھ کئی جھنجھنے بج اٹھے۔ شاید کوئی بھولا بھٹکا آنسو بھی بہہ نکلا ہو۔ وہ جلدی سے گردوارے کی سیڑھی پر بیٹھ گیا اور نالی میں بہتے ہوئے سیاہ گندے پانی کو تکنے لگا۔ سردی کی ایک تیز لہر اس کی ہڈیوں کو جھنجھنا گئی۔

اب اسے ایک لخت شدید بھوک کا احساس ہوا۔ طرح طرح کے خیالات اس کی کھوپڑی میں کلبلانے لگے۔ اس نے سوچا اگر وہ ماسٹر اللہ دتا کے ہاں پیدا ہونے کی بجائے شیخ احمد دین کے ہاں پیدا ہوتا تو کتنا مزہ آتا۔ شیخ کے بیٹے فیاض کی طرح اجلے کپڑے پہنتا۔ مونگ پھلی اور ریوڑیاں کھانے کو پیسے ملتے۔ چند لمحوں کے لئے اسے محسوس ہوا کہ وہ سچ مچ شیخ احمد دین کا بیٹا ہے میلے کچیلے پھٹے پرانے کپڑوں کی بجائے اس نے بوسکی کی قمیض پہن رکھی ہے جو اس کے جسم کو بوسے دے رہی ہے۔ وہ بڑھ کر نذیرے کی بھینگی آنکھوں کے سامنے خوانچے سے مونگ پھلی اٹھاتا ہے اور تک کر چھلکوں سے اس کے سر کو نشانہ بناتا ہے پھر اس کی بھینگی آنکھ کی نقل اتارتا ہے لیکن نذیرے کو غصے کی بجائے ہنسی آتی ہے وہ خود اپنے ہاتھ ریوڑیوں کی بھی ایک مٹھی بھر کر اس کی طرف بڑھا دیتا ہے پھر دوسرے دن وہ شیخ سے تھوڑی سی مونگ پھلی اور ریوڑیوں کے بدلے پورے آٹھ آنے وصول کرتا ہے۔ شہابو کو جھرجھری سے آئی۔

پر شیخ تو جوا کھیلتا ہے اور سمگلنگ کرتا ہے اسے ایک دم سے شیخ سے نفرت ہو گئی اس نے فوراً شیخ سے اپنے سارے تعلقات منقطع کر لئے پھر اس نے دل ہی دل میں سارے محلے کا طواف کیا بدرو کے پل سے لے کر عیسائیوں کے گرجے تک تاکہ کوئی اچھا سا آدمی مل جائے جس کو کم از کم تصورات کی دنیا میں ہی وہ اپنا باپ بنا سکے۔

ابھی وہ حاجی رحیم کے متعلق سوچ رہا تھا کہ اسے اپنے قریب تیز تیز بدبودار سانس کا احساس ہوا اس

نے ہڑبڑا کر اٹھنے کی کوشش کی تو اس کا پاؤں نالی کے بساندھے پانی سے بھیگ گیا اور سردی کی ایک تیز لہر ایک بار پھر اس کی ہڈیوں کو گدگدا گئی۔ وہ نذیرا تھا۔ شہابو اس کی بھیانک آنکھوں کو اتنا قریب پاکر ڈر گیا۔ اس کی رگوں میں خون منجمد ہونے لگا۔ اس نے بغیر سوچے سمجھے بھاگنے کی کوشش کی۔ مگر نذیرے نے اپنے مضبوط ہاتھوں سے اس کا بازو تھام لیا "چل۔ ذرا خوانچہ تو اٹھوا دے"

شہابو کی جان میں جان آئی اور وہ چپ چاپ نذیرے کے ساتھ بدرو کے پل پہ آگیا اور خوانچہ نذیرے کے سر تک اٹھوا دیا۔

اسے نذیرا اچھا لگا۔ اسے امید تھی کہ وہ خوانچہ سر پر رکھنے کے بعد ایک مٹھی مونگ پھلی تو اسے ضرور دے گا نذیرے نے مڑ کر بھی نہ دیکھا اور تاریک سڑک پر چل دیا۔ شہابو کچھ دیر وہیں کھڑا اسے دیکھتا رہا پھر دل ہی دل میں اسے ماں بہن کی گالیاں دینے لگا۔

بدرو کا پل ایک بھیانک دیو کی طرح منہ کھولے رات کی بھیانک تاریکی کو دیکھ رہا تھا۔ دور دور تک کوئی متنفس دکھائی نہ دیتا تھا۔ شاہ عالم کی دوکان سے لال ٹین کی مدہم روشنی کواڑوں کی درازوں سے جھانک رہی تھی۔ شہابو چپ چاپ بدرو کے ٹھنڈے یخ بستہ پل پر بیٹھ گیا۔ پھر وہ اچانک زور زور سے گالیاں بکنے لگا۔ اس نے خوب گالیاں بکیں پھر فتح مندی کے احساس سے قہقہے لگانے لگا۔ اس کے قہقہے سکھوں کے گردوارے کی اونچی اونچی دیواروں سے سر ٹکرا کر واپس لوٹ آئے

پھر وہ اچانک سنجیدہ ہو گیا۔ اسے بھوک کا احساس ہوا اور اس کا دماغ ایک بار پھر سوچوں کی دلدل میں پھنس گیا۔

'آخر سب لوگ اتنی جلدی گھروں کو کیوں چل دیتے ہیں۔ کوئی یہاں نہیں۔ پھر اسے غصہ آنے لگا اور وہ بڑبڑاتا ہوا گھر کو چل دیا۔

گلی میں سب مکانوں سے روشنی کے دھارے پھوٹ رہے تھے۔ ایک بار پھر اس پہ گالیوں کا دورہ پڑا ایک کونے میں ایک پلے کو آرام سے سوتے ہوئے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا اس نے ایک پتھر اٹھا کر پلے کے سر پہ دے مارا۔ کت چیاؤں چیاؤں کرتا ہوا ایک طرف بھاگ گیا۔

گھر کا دروازہ حسب معمول کھلا تھا۔ اندر ویرانیاں اپنا بھیانک منہ کھولے اس کی منتظر تھیں اس کے تینوں بڑے بھائیوں میں سے ابھی تک کوئی نہ پلٹا تھا شہابو نے سوچا وہ کسی دودھ دہی والی دوکان میں بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف ہوں گے۔ اس کی ماں بھی ابھی تک نہ لوٹی تھی۔ زمیندار کے ہاں برتن بھی تو بے پناہ ہوتے ہیں اسے فارغ ہوتے ہوتے گیارہ تو بج ہی جاتے ہیں اور جب تک ماں نہ آئے کھانا بھی نہیں آتا اور کھانا نہ کھایا ہو تو بھوک لگتی ہے اور بھوک لگے تو ساتھ ہی سردی لگتی ہے اور سردی لگے تو گنے کے چھلکوں کی آگ یاد آتی ہے۔

وہ کونے میں جھلنگا چارپائی پر گٹھڑی بنے باپ کی طرف بڑھا۔

"چاچا۔ ماں نہیں آئی؟ بھوک لگی ہے"۔

ماسٹر اللہ دتہ نے پھٹے ہوئے لحاف کے کسی سوراخ میں سے منہ نکال کر شہابو کو گالیاں دینے کی کوشش کی جن میں سے اکثر اس کی کھانسی اور اکھڑے ہوئے سانس کی وجہ سے نامکمل رہ گئیں۔

"... تمہیں کھانے کے علاوہ بھی کچھ سوجھتا ہے؟"

شہابو خاموشی سے مڑا اور صحن میں مرغیوں کے ڈربے کے پیچھے بوسیدہ دیوار کی اکھڑی ہوئی اینٹوں کو اٹھا اٹھا کر دیکھنے لگا۔ اس نے کئی بار ماں کو وہاں روٹی چھپاتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس ساری کوششیں بیکار ثابت ہوئیں وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ ایک اینٹ اس دوران اپنی جگہ سے گرتی اور اینٹ کے گرتے ہی اسے اپنے باپ کی زہر میں بجھی آواز سنائی دی

"ڈھونڈھ۔ خوب ڈھونڈھ۔ وہاں زہر رکھا ہے"

پھر شہابو نے شدید کھانسی کی آواز سنی وہ چپکے سے باہر نکل آیا۔ ٹھنڈی یخ ہوا سے اسے جھرجھری آگئی۔ وہ تاریکی میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا۔ تھوڑی دیر کے لئے بھوک پہ سردی کا احساس غالب آگیا ساری دنیا ایک گرم گرم لحاف بن گئی۔ شہابو اس کی طرف بڑھنے لگا۔ پھر اس نے اپنے آپ کو پوری طرح اس لحاف میں چھپا لیا۔ مگر سردی کا احساس کم نہ ہوا

دور کتیا کے غرانے کی آواز سن کر وہ چونک پڑا حاجی رحیم کے برآمدے میں اس کی کالی کتیا دبکی پڑی تھی اس کے نیچے اس کے سینے سے چمٹے ابھی تک اسے بھنبھوڑ رہے تھے۔ شہابو نے ایک بار پھر تاریکی میں گھورا کہ شائد اس کی ماں آرہی ہو۔ مگر وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ اس کا دل دھڑکنے لگا۔ اس کے سینے میں نفرت کا لاوا ابلنے لگا۔

سارا دن غائب رہتی ہے رات گئے آتی ہے اور پڑ کر سو جاتی ہے اور اس کے بعد گالیوں کا ایک طوفان آگیا جس میں ماں کی محبت ایک تنکے کی طرح بہہ گئی۔

اکبر کاظمی

غزل

سنتا ہوں جب بھی غور سے میں صبح کی اذاں
دل میں ابھرنے لگتی ہے جذبوں کی کہکشاں

کاغذ پہ آکے لفظ یوں دیتا ہے روشنی
جیسے کسی غریب کا جلتا ہوا مکاں

لہرا رہا ہے جبر کا پرچم فضاؤں میں
چپ چاپ تک رہا ہے بلندی سے آسماں

سائے سمٹ رہے ہیں سیاہی کے خوف سے
لرزاں ہیں اونچے اونچے درختوں کی ٹہنیاں

آنکھیں کھلے کواڑ ہیں چہرے لٹے سہاگ
پہلے تو یوں نہ تھیں مرے گاؤں کی لڑکیاں

یارب دعا ہے شہر کے بچوں کی خیر ہو
آندھی سے چیخنے لگیں ہر گھر کی کھڑکیاں

وہ دھول ہے کہ سانس بھی لینا محال ہے
وہ دھوپ ہے، کہ دن میں قیامت کا ہے سماں

کوفہ بھی ہے یزید بھی اور کربلا بھی ہے
ابنِ علیؑ کے چاہنے والے مگر کہاں

جیسے لبِ فرات ہوں خیمے جلے ہوئے
اب نیک خواہشات پہ ہوتا ہے یوں گماں

پہنچا ہوں کتنی دور میں تیری تلاش میں
رستے لہو لہو ہیں فضائیں فغاں فغاں

وہ خود نما جو خود کو سمجھتا رہا خدا
اس شخص کی زباں بھی نہ تھی دل کی ترجماں

بازار کو چلا ہے تو دامن بھی دیکھ لے
سستی بجز بشر کے نہیں کوئی شے یہاں

بجھتے چراغ جلتے ہوئے لوگ کاظمی
اس دورِ ارتقا کے فسانوں کی سرخیاں

حنیف باوا

اُٹھدا دُھوآں

وڈے مل دی
چٹے مِل دی
اوچی چمنی دے منہ وچوں
دھوآں اُٹھے
تے اجر دی ٹیسی وتے
اُڈدا جاتے اُڈدا جاتے
مِل لوں آنچ نہ آتے
مزدوراں دی حیاتی وچوں
دھواں اُٹھے
کالا دھوآں
مل دی چمنی جھات نہ پاتے
چٹا مِل
جان بجھ کے
سورداس بن جاتے
مزدوراں دی حیاتی وچوں
اُٹھدا دھواں
مزدوراں نوں کھا جاتے

الفتح

انقلابِ چین نے

غریب کشتی بانوں کے دامن میں

پیکنگ سے احفاظ ال



ایک چینی اُستاد طلبہ کو مطالعہ میں مدد دے رہا ہے

کوانچو میں دریائے چو (PEARL RIVER) کا منظر بڑا دلفریب ہے، یہ دریا شہر کے اندر سے گذرتا ہے، لوہے کا ایک مضبوط پل دونوں بازوؤں کو ایک دوسرے سے ملاتا ہے، جس پر خاصا بھاری ٹریفک ہوتا ہے اس کے مشرقی کنارے پر بہت سی بلند عمارتیں کھڑی ہوئی ہیں جن میں صنعتی نمائش کی عمارت اور شہر کی سب سے بلند عمارت بھی شامل ہے، دوسرے کنارے پر سب سے پہلے جس چیز پر نظر پڑتی ہے، وہ پیلے رنگ کی پانچ چھ منزلہ عمارتوں کا ایک طویل سلسلہ ہے، دریا میں ہر طرف سینکڑوں قسم کی کشتیاں اسٹیمر آتے جاتے نظر آتے ہیں، یہ کشتیاں کوانچو میں نقل وحمل کا ایک اہم ذریعہ ہیں، مختلف قسم کی اشیاء سے بھری ہوئی کشتیاں تیزی سے اِدھر اُدھر تیرتی نظر آتی ہیں، کشتی بان روایاتی طرز کے ہیٹ پہنے ہوئے مستعدی کے ساتھ چپو چلاتے ہیں اور بڑی حرارت اور تڑپ کے ساتھ نئے چین کی تعمیر میں اپنا حصہ ادا کرنے کے لئے ہر لحظہ مصروف عمل نظر آتے ہیں، دریائے چو کے دوسرے کنارے پیلے رنگ کی پانچ چھ منزلہ عمارتوں کا جو سلسلہ پھیلا ہوا ہے، وہ انہیں "کشتی بانوں کا محلہ" ہے، جس میں وہ ایک نئے سرے سے زندگی بسر کر رہے ہیں۔

نئے چین کی نئی اور روشن زندگی کا ذکر آتا ہے تو پرانے تلخ دنوں کا ذکر ناگزیر ہوتا ہے اسی سے ہمیں یہ اندازہ ہوتا ہے کہ چین کے نئے نظام نے صدیوں کے کچلے ہوئے لوگوں کے دامن میں کتنی انجانی خوشیاں بھر دی ہیں۔ اس نے انہیں ان رنگوں سے آشنا کیا ہے جن سے وہ صدیوں سے ناآشنا تھے۔ اس نے انہیں وہ خوشیاں دی ہیں جن کا وہ کبھی تصور تک نہیں کر سکتے تھے۔

اس محلے میں رہنے والے کشتی بان جب اپنی زندگی کا ذکر کرتے ہیں تو ان کی آنکھیں چمک اُٹھتی ہیں، لیکن دوسرے ہی لمحے ان کے چہروں پر ماضی کی تلخ زندگی کی پرچھائیاں اُبھر آتی ہیں پرانے نظام سے نفرت کا جذبہ ان کی آنکھوں میں جھلکنے لگتا ہے۔ جب کوئی اجنبی ان کی پرانی زندگی کے حالات سنتا ہے تو اس کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، ماضی میں یہاں کے نوّے فیصد کشتی بان کشتیوں پر رہتے تھے۔ انہیں خشکی پر رہنے کی اجازت نہیں تھی۔ ان کی اپنی پانی کی دنیا تھی۔ وہ دن بھر اپنے مضبوط و توانا ہاتھوں سے چپو چلاتے تھے اور رات کو اپنے بیوی بچوں کے ساتھ ان چھوٹی چھوٹی اندھیری جھونپڑیوں میں پڑ کر سو رہتے وہ خشکی پر رہنے والوں سے شادی نہیں کر سکتے تھے۔ ان کے بچے خشکی پر تعلیم حاصل نہیں کر سکتے تھے، نوّے فیصد سے زیادہ افراد ایک حرف تک نہیں پڑھ سکتے تھے۔ مرنے کے بعد انہیں زمین میں دفن ہونے کے لئے دو گز زمین تک نہیں دی جاتی تھی؛ خشکی پر رہنے والے انہیں "انڈے والے" اور "انڈے والیاں" (تان ژن) کہتے تھے (چینی زبان میں یہ لفظ حقارت کا اظہار کرنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے) ان پر ان گنت ٹیکسوں کا بوجھ تھا۔ یہاں تک کہ ان کی ویران کشتیوں پر جو بجھا بجھا سا چراغ جلتا تھا۔ اس پر بھی انہیں ٹیکس دینا پڑتا تھا نئے سال کے موقع پر بندرگاہ کا ٹھیکیدار جبری طور پر ان سے تحفے تحائف وصول کرتا تھا۔ پھر انہیں اس کے لئے بیگار بھی کرنی پڑتی تھی۔ خشکی کے لوگ دریا میں جو گلی سڑی سبزیاں اور پھل پھینکتے تھے، وہ انہیں اُبال کر کھاتے تھے۔ انہیں ایک چیتھڑے کے علاوہ دوسرا چیتھڑا کبھی میسر نہیں ہوا، ایک وقت کے کھانے کے بعد دوسرے وقت کا کھانا یقینی نہیں ہوتا تھا



چھانگشا کے مرکزی بازار میں احفاظ الرحمٰن ایک ویتنامی کامریڈ کے ساتھ

پیکنگ سے شاؤ تشان تک

...یں خوشیوں کے پھول بھر دیئے

...الرحمٰن نے لکھا

بہت سے کشتی بان اس زندگی سے بیزار ہو کر دوسری جگہ بھاگ جاتے تھے، آئے دن دریا میں کشتی بانوں کی لاشیں تیرتی نظر آتی تھیں، غلاظت میں لتھڑے ہوئے ان کے بچے بیمار پڑتے تھے تو ان کے والدین انہیں دوا فراہم نہیں کر سکتے تھے، خود ہی لوٹ پوٹ کر ٹھیک ہو جاتے یا ان کے والدین کی محرومیوں میں ایک اور محرومی کا اضافہ ہو جاتا اور دریا میں ایک اور لاش تیرنے لگتی، کومنتانگ کے ظالم غنڈے انہیں بات بے بات روئی کی طرح دھن ڈالتے تھے۔ اگر کسی کشتی بان کے تین لڑکے ہوتے تھے تو ان میں سے دو کو کومنتانگ فوج میں جبری طور پر بھرتی کر لیا جاتا تھا۔ اگر اس کے دو لڑکے ہوتے تھے تو ان میں سے ایک پر کومنتانگ کا حق ہوتا تھا۔ اور جب وہ جاتے تھے تو کبھی واپس نہیں آتے تھے۔ بہت جلد تو یوں کا ایندھن بن جاتے تھے۔ کشتی کھیتے کھیتے ان کے والدین کے بال سفید ہو جاتے اور تاریک دنیا سے نکلنے کی خواہش اپنے سینوں میں سمیٹے ہمیشہ کے لئے اپنی آنکھیں موند لیتے۔ جس طرح وہ خشکی پر نہیں جا سکتے تھے۔ اسی طرح ان کے دکھوں کے لئے بھی خوشیوں کا کوئی کنارا نہیں تھا۔ اگر کسی کا کوئی لڑکا نہیں ہوتا تھا۔ تو اسے اس "جرم" میں ایک اور ٹیکس ادا کرنا پڑتا تھا بعض اوقات ایسا بھی ہوتا تھا۔ کہ لڑکے فوج میں نہیں جانا چاہتے تھے، وہ جانتے تھے کہ اگر وہ گئے تو کبھی واپس نہ آئیں گے اس لئے انہیں اس جبری بھرتی سے بچنے کے لئے کومنتانگ کے ظالم حکام کو رشوت دینی پڑتی تھی، اس



ایک کسان طالب علم شِن وا یونیورسٹی کے طلباء کو اپنے تجربات سے آگاہ کر رہا ہے

کے باوجود اکثر صورتوں میں وہ زبردستی آکر ان کے لڑکوں کو پکڑ لے جاتے تھے، بہت سے بھاگ نکلتے تھے۔ لیکن اکثر پکڑ لئے جاتے تھے اور ان کے سر مونڈ دیئے جاتے تھے تاکہ دوبارہ بھاگیں تو آسانی سے شناخت کر لئے جائیں اور پھر وہ ان کو اتنی اذیتیں دیتے تھے کہ انہیں دوبارہ بھاگنے کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔ تھوڑا بہت جب کام ملتا تھا۔ تو انہیں اگلے وقت کے کھانے کا آسرا ہو جاتا تھا۔ ورنہ اکثر پیٹ پر پتھر باندھ کر سونا پڑتا۔ بہت سے کشتی بانوں کو اپنے پیٹ کی آگ بجھانے کے لئے اپنے بچوں کو بیچنا پڑتا تھا۔ کتنے کشتی بان خشکی پر رہنے کی تمناؤں میں لئے اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ زمین جو ماں ہے زمین جس کی چھاتی سمندر جتنی وسیع ہے ان سے قریب ہونے کے باوجود بہت دور تھی۔

اب یہ ان کی پہلی نسل ہے جو خشکی پر آباد ہوئی ہے۔ ہم دریائے چُو کے دوسرے کنارے پیلے رنگ کی ان اُونچی اُونچی بلڈنگوں میں سے ایک بلڈنگ کے ایک فلیٹ میں کشتی بانوں کے محلے کی انقلابی کمیٹی کے اراکین سے بات چیت کر رہے تھے انقلابی کمیٹی کا ایک رکن بڑے جوش و خروش کے ساتھ کہہ رہا تھا "ہم چیئرمین ماؤ کے احسان مند ہیں، ہم انہیں کبھی نہیں بھول سکتے، انہوں نے ہمیں نئی زندگی عطا کی ہے۔ ہماری کتنی نسلیں زمین کی مہک سے نا آشنا رہیں، ہم ہزاروں سال سے پانی میں رہتے آئے تھے، اب ہماری پہلی نسل زمین پر پروان چڑھ رہی ہے، ہمارے اوپر ٹیکسوں کا بوجھ نہیں ہے۔ ہم پیٹ بھر کر کھاتے ہیں اور اچھا لباس پہنتے ہیں، ہمارے بچے اسکولوں میں تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ اب یہاں ہماری حکومت ہے۔ ہم اپنے مسائل خود حل کرتے ہیں۔ اب ہم پر کسی شخص کو حکم چلانے کی جرأت نہیں ہوتی، ہم چیئرمین ماؤ کے احسان مند ہیں، وہ ہمارے نجات دہندہ ہیں، اس نے اپنی سُرخ کتاب اُوپر اُٹھائی اور جوش و خروش سے نعرہ لگایا: "ماؤ چوشی وان سوئے"۔ (چیئرمین ماؤ زندہ باد)

یہ بلڈنگیں جن میں کشتی بانوں کی پہلی نسل آباد ہے ۱۹۶۴ء میں تعمیر کی گئی تھیں۔ کل ۵۸ بلڈنگیں ہیں، جو تین منزلہ سے لے کر چھ منزلہ تک ہیں، اور ان میں کل ۲۹۳۰۰ افراد رہتے ہیں۔ ان کا ایک نمائندہ کوانچو کی انقلابی کمیٹی کا اور دوسرا نمائندہ کمیونسٹ پارٹی کی ضلعی شاخ کا رکن ہے

ان کے علاقے میں چار پرائمری اسکول تعمیر کئے جا چکے ہیں، جن میں سے ایک اسکول ہم نے بھی دیکھا۔ بہت بڑی عمارت تھی جس میں کل اٹھارہ سو بچے تعلیم حاصل کر رہے ہیں اساتذہ کی تعداد "چھپن" ہے۔ یہاں ایک کلینک بھی ہے، جس میں مغربی طب کے ماہر ڈاکٹر کام کرتے ہیں۔ جن میں سے ایک ہڈیوں کا ماہر ہے، ان کے علاوہ چینی طب جاننے والے دو ڈاکٹر بھی یہاں موجود ہیں، ایک بڑی مارکیٹ اور بہت سے اسٹور ہیں یہاں اناج، سبزیاں اور گوشت سے لے کر ہر چھوٹی بڑی چیز خریدی جا سکتی ہے۔

رات کے آٹھ بجے تھے اور ہم اس علاقے کا چکر لگا رہے

کومنتانگ کے عہد میں اُنہیں چراغ پر بھی ٹیکس دینا پڑتا تھا

تھے تمام بلڈنگیں روشنی سے جگمگا رہی تھیں. ہلکی سی گرمی پڑ رہی تھی. لوگ بالکونیوں میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے. گلیوں میں کھیلتے بچوں کی نظر ہم پر پڑی تو وہ ہماری طرف دوڑ پڑے، دھیرے دھیرے ہمارے گرد لوگوں کا دائرہ پھیلتا جا رہا تھا. ہر چہرہ جانا پہچانا سا لگ رہا تھا. ہر آنکھ میں اپنائیت جھلک رہی تھی. ایک فلیٹ میں ایک نوجوان اُونچی لے میں کوئی چینی ساز بجا رہا تھا. ایک طالب علم ٹیبل لیمپ کی روشنی میں سر جھکائے مطالعہ کر رہا تھا. ایک بچہ زور زور سے روتے جا رہا تھا اور اس کی ماں پیار سے اسے چمکار رہی تھی. محبتوں کے سارے رنگ، خوشبوں کا تمام حسن وہاں سمٹ آیا تھا. ہر طرف رونق تھی، ہلچل تھی، تڑپ تھی، یہ وہ "انڈے والے" اور "انڈے والیاں" تھیں جنہیں مٹی کے چراغ کا ٹیکس دینا پڑتا تھا. جنہیں زمین میں دفن ہونے کی اجازت نہیں تھی اور جنہیں رشوت دینے کے باوجود زبردستی فوج میں بھرتی کر لیا جاتا تھا. مجھے انقلابی کمیٹی کے رکن کا جملہ یاد آ رہا تھا، "یہ ہماری پہلی نسل ہے جو خشکی پر آباد ہوئی ہے. ہم صدر ماؤ کے احسان مند ہیں، وہ ہمارے نجات دہندہ ہیں". "ماؤ جو شی وان سوئے"!

ہم ایک بوڑھے کشتی بان کے فلیٹ میں گئے جو اب ریٹائرڈ ہو چکا ہے، دروازے پر پورے خاندان نے گرمجوشی کے ساتھ ہمارا خیر مقدم کیا، یہ گھرانا چھ افراد پر مشتمل ہے، اس کے دو بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں جو جوان ہو چکے ہیں اور مختلف اداروں میں کام کرتے ہیں اس کی بیوی جو دیہاتی عورتوں کی طرح بڑی بے تکلف اور سادہ سی تھی، ہمارے لئے کیتلی سے پیالوں میں چینی چائے انڈیلنے لگی جسے وہ بغیر چینی کے پیتے ہیں، بوڑھا کشتی بان ہمیں سگریٹ پیش کر رہا تھا. میں نے کمرے پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالی، کھڑکیوں اور دروازوں پر خوبصورت پردے پڑے ہوئے تھے. دیواروں پر چیئرمین ماؤ کی تصویریں لگی ہوئی تھیں. ایک بڑی سی میز اور چند کرسیاں بڑی قرینے سے رکھی ہوئی تھیں (یہ میز اور کرسیاں ریٹائرڈ کشتی بان نے اپنی پرانی کشتی کی لکڑی سے بنائی ہیں) بوڑھا کشتی بان کہہ رہا تھا. ہم آپ کے شکر گذار ہیں، ہم آپ کا خیر مقدم کرتے ہیں دنیا بھر کے عوام ایک جیسے ہیں. شروع شروع میں دونوں طرف جو جھجک تھی وہ ختم ہوتی جا رہی تھی. اب وہ گرمجوشی کے ساتھ ہمیں اپنی زندگی کے حالات بتا رہا تھا. ریٹائرڈ ہونے سے پہلے اسے سو یوان (دو سو روپے) ماہانہ تنخواہ ملتی تھی، اور اب اسے اس کا ستر فیصد حصہ یعنی ستر یوان پنشن کے طور پر ملتے ہیں. اس کے علاوہ اس کے بیٹے اور بیٹیاں بھی کام کرتی ہیں اور اب ان کی آمدنی اتنی معقول ہے کہ وہ بڑی خوشحالی کی زندگی بسر کر رہے ہیں. جب ہم نے اس کے ماضی کے بارے میں سوال کیا تو اس نے کہا کہ ہم میں اور جانوروں میں کوئی فرق نہیں تھا، ہم دن رات محنت کرتے تھے لیکن ہمیں پیٹ بھر کر کھانا کبھی نہیں ملا. اس کی بوڑھی آنکھوں کے ٹھہراؤ کے پیچھے ماضی کی ساری تلخیاں جھلک رہی تھیں کومنتانگ کے حکام بہت ظالم تھے، وہ عوام کے دشمن تھے اور دولت مندوں کے اشاروں پر ناچتے تھے، وہ زبان سے عوام کا دم بھرتے تھے. لیکن دراصل وہ موقع پرست اور جاہ پرست تھے. ہمیں اچھی طرح معلوم تھا کہ ہم دن بھر محنت کرنے کے باوجود رات کو بھوکے کیوں سوتے ہیں. اگر چیئرمین ماؤ نہ ہوتے تو ہمیں غلامی کی اس زندگی سے نجات نہ ملتی!

اس نے کہا آزادی سے قبل کی آمدنی کے بارے میں کچھ بتانا مشکل ہے کیونکہ کومنتانگ کی کرنسی غیر مستحکم تھی، اس میں اُتار چڑھاؤ ہوتا رہتا تھا اور آج کے مقابلے میں اشیا کی قیمتیں بھی زیادہ تھیں یوں سمجھ لیجئے کہ مہینے کے بعد جو رقم ملتی تھی. اس سے ۶ جن (تقریباً تین سیر) چاول خریدا جا سکتا تھا جبکہ اب اتنا چاول صرف آٹھ یوان (سولہ روپے) میں ملتا ہے.

ریٹائرڈ کشتی بان نے ہمیں گرمجوشی کے ساتھ رخصت کیا اور ہمیں دوبارہ اپنے گھر آنے کی دعوت دی

اس کے بعد ہم ایک اور کشتی بان کے گھر گئے، یہ خاصا بڑا گھرانا تھا. بوڑھے میاں بیوی کے علاوہ چار لڑکے اور ۳ لڑکیاں

ہم آخری دم تک طبقاتی جدوجہد کرتے رہیں گے

ہیں. ایک لڑکا اور ایک لڑکی شادی شدہ ہے، بڑی بی کی ماں بھی انہیں کے ساتھ رہتی ہے، اس گھر میں دو تین چھوٹے چھوٹے بچے بھی ہیں. سب ہمارے سامنے آ کھڑے ہوئے انقلابی کمیٹی کے ایک رکن نے ان سب کا تعارف کرایا. سب شرما سے رہے تھے ایک بچہ سو رہا تھا جسے اس کی ماں اٹھا کر لائی تھی کہ وہ غیر ملکی مہمانوں کی "زیارت" کر لے، بات چیت شروع ہوئی بڑے میاں ذرا خاموش طبع تھے، بڑی بی زیادہ بول رہی تھیں، اور وہ خاموشی سے ان کی باتیں سن رہے تھے. کبھی کبھی مسکرا کر اثبات میں سر ہلا دیتے کہ یہ ٹھیک کہہ رہی ہے. بڑی بی نے بتایا کہ ان کا ایک لڑکا پہلے سپاہی تھا. اور اب جہاز سازی کے کارخانے میں کام کرتا ہے، دوسرا بیٹا پہلے مٹھائی کے کارخانے میں کام کرتا تھا اور اب سپاہی بن گیا ہے. تیسرا بیٹا ہائی اسکول کی تعلیم حاصل کر چکا ہے اور اب ایک اسکول میں ٹیچر ہے، سب سے چھوٹا بیٹا جونیئر مڈل اسکول کے آخری سال میں ہے، بڑے میاں ایک کارخانے میں کام کرتے لگے ہیں.

یہ بڑی بی خود بھی اپنے ہاتھوں سے کشتی چلاتی رہی ہیں. اس لئے ماضی کا ذکر کرتے وقت ان کا لہجہ بہت تلخ ہو جاتا تھا یوں محسوس ہوتا تھا جیسے برسوں کی بھری بیٹھی ہوں، بڑی بے تکلفی کے ساتھ بات کر رہی تھیں اور ذرا سی بھی اجنبیت محسوس نہیں کر رہی تھیں. اس کے انداز میں مجھے اس بات کا اچھی طرح احساس ہوا کہ وہی اس کائنات کا مالک ہے، کام ہوتا تھا. تو کھانا ملتا تھا. ورنہ ہم چپ چاپ کونے میں دبک کر منہ چھپائے پڑے رہتے، سرمایہ داروں کے غنڈے بات بے بات ہم پر ڈانٹ پھٹکار کرتے رہتے تھے، پولیس الگ تنگ کرتی تھی. ہم پر ہر وقت خوف و دہشت طاری رہتا تھا وہ کمینے ہمیں خشکی میں رہنے کی اجازت نہیں دیتے تھے. زمین ان کے باپ کی تھی. ہمارے بچے ننگے پھرتے تھے اور ان کے بچے کاروں میں گھومتے تھے. ہم کام کرتے تھے اور وہ اپنی کوٹھیوں میں مزے کی نیند سوتے تھے، اب ہمارے بچے تعلیم حاصل کر سکتے ہیں. ہم روشن ہوادار فلیٹوں میں رہتے ہیں. ہمیں زندگی کی تمام خوشیاں میسر ہیں. ہم پچھلے دنوں کو یاد کرتے ہیں تو ہمارا طبقاتی شعور بلند ہو جاتا ہے ہم طبقاتی جدوجہد کرتے رہیں گے.

بڑی بی تیز و تیکھے لہجے میں بولتی رہیں اور بڑے میاں مسکرا مسکرا کر سر ہلاتے رہے بچے اپنی ماؤں کی گودوں میں سمٹے ہوئے بڑے غور سے "وائیکو پھینگو" (غیر ملکی دوستوں) کی طرف دیکھتے رہے. میری نظر بار بار دیوار پر لگی ہوئی چیئرمین ماؤزے تنگ کی تصویر کی طرف دوڑ جاتی، ان کی روشن، فراخ پیشانی کے اندر کتنا بڑا انقلاب سمٹا ہوا تھا.

انقلابی کمیٹی کے کارکن ایک بار پھر ہمیں اپنے دفتر میں لے گئے. ایک بار پھر ہمارے پیالے چائے سے بھر دیئے گئے اور

باقی صفحہ ۴۲ پر ملاحظہ فرمائیں

سرمایہ دار معاشرے کا دُوسرا رُخ

وہ بورژوا طبقہ، سماجی کارکن اور امریکی صدر کے دشمن ہیں



فلمی اداکار کے مکان کا ملبہ



دیتھر مین کی کارکن ڈیانا اوٹن

اس تنظیم کے کارکن لکھ پتیوں کے چشم و چراغ ہیں

نون - الف

جب وہ پیدا ہوتے ہیں تو ان کے منہ میں چاندی کا چمچہ ہوتا ہے انہیں ہر طرح کی آسائشیں میسر ہوتی ہیں، مگر جب وہ بچپن کی حدود سے نکل کر جوانی کی سرحدوں میں داخل ہوتے ہیں تو ان کے دل میں سوسائٹی کے خلاف نفرتوں کا سمندر ٹھاٹھیں مارتا ہے - ان کے دونوں ہاتھوں میں بم ہوتے ہیں، ان کی موت کبھی کبھی بے حد المناک ثابت ہوتی ہے عام طور پر ان کے والدین امیر ہوتے ہیں وہ اعلےٰ اسکولوں میں تعلیم حاصل کرتے ہیں - چھٹیوں میں انہیں لینے کے لئے گھر سے نفیس اور قیمتی گاڑیاں آتی ہیں - پھر بھی ان کی پوری زندگی بے چینی اور بے اطمینانی میں گذرتی ہے -

اس عجیب و غریب گروپ سے تعلق رکھنے والے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں اپنے آپ کو ودیتھرمین' کہلواتے ہیں - امریکہ میں ان کی اچھی خاصی تعداد ہے چرس کی سگریٹ پیتے ہیں اور "خنزیروں" کو قتل کرنے کی قسم کھاتے ہیں -

"میری زندگی کا مقصد سوسائٹی کے ان "خنزیروں" کو قتل کرنا ہے اور میں کبھی اس عظیم مقصد سے اپنا ہاتھ نہیں کھینچوں گا"۔

ودیتھرمین "سور" کی اصطلاح کن لوگوں کے لئے استعمال کرتے ہیں؟ ان کے انتقام کا نشانہ سوسائٹی کا کوئی شخص بھی بن سکتا ہے، مگر ان کا بنیادی نشانہ "سور" ہی ہیں - ان کی لغت میں پولیس مین، جج امراء اعلیٰ طبقہ سے تعلق رکھتے والے شرفاء سماجی کارکن اور امریکہ کے صدر "خنزیر" ہیں -

برنارڈائن، ڈوہرن ایک امیر گھرانے سے تعلق رکھتی ہے اسے اپنے گھر سے اور اپنے والدین سے سب کچھ ملا جو ایک امیر خاندان سے تعلق رکھنے والے لڑکا یا لڑکی کو حاصل ہونا چاہیئے اس کے باوجود اپنے ماحول سے بیزار ہوگئی - بیزاری اس حد تک بڑھی کہ اس نے اس طبقے سے تعلق رکھنے والے دوسرے افراد کو اپنے انتقام کا نشانہ بنانا شروع کر دیا - اس کے دل میں اچانک انتقام کی آگ کہاں سے جل گئی، اس کے بارے میں کسی کو کوئی علم نہیں - ماہرین سماجیات اور نفسیات کا کہنا ہے کہ "اسے نفرت ورثے میں ملی - اس نے ہوش سنبھالتے ہی دیکھا - اس کا باپ دوسروں کا استحصال کر کے اپنی دولت میں بے پناہ اضافہ کر رہا ہے - اس کے والدین دوسروں کو اپنے مقابلہ میں کمتر سمجھتے ہیں، گھر کی لونڈیوں، باندیوں اور نوکر چاکر سے حیوانوں جیسا سلوک کیا جاتا ہے جہاں وہ بیٹھتے ہیں اور وہ کھاتے ہیں - اس جگہ انہیں بیٹھنے کی اجازت ہے نہ کھانے کی برنرڈائن کو اس ماحول سے نفرت پیدا ہوگئی، اگر اس کی نفرت کو صحیح سمت موڑ دیا جاتا تو شاید وہ اور اس کے دوسرے ساتھی کارآمد انقلابی بن جاتے ان کی نفرتوں کا مرکز فرد نہ بنتے بلکہ سوسائٹی کے کہنہ مروجہ اصول بنتے جو انسان کے ہاتھوں انسان کے استحصال کا درس دیتے ہیں

برنرڈائن مقامی اسکول کی ذہین ترین طالبہ تھی اس نے اسکول کے سارے امتحانات امتیازی حیثیت سے پاس کئے انعامات بھی ملے - یونیورسٹی آف شکاگو آف لاء اسکول سے آنرز میں کامیاب ہوئی وہاں سے نکل اچانک وہ ودیتھرمن گروپ میں شامل ہوگئی - یہ وہی لڑکی ہے جو ودیتھرمین کے کنونشن میں شیرون ٹیٹ کے قتل پر بے پناہ خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا "پہلے انہوں نے ان خنزیروں کو قتل کیا، پھر اسی کمرے میں بیٹھ کر کھانا کھایا - کمرہ میں ان کی لاشیں پڑی تھیں - کس قدر پُرجوش واقعہ ہے"۔

ودیتھرمین کے کارکن جنس کو کوئی اہمیت نہیں

اُن کے ایک ہاتھ میں مشین گن اور دُوسرے ہاتھ میں گیٹار ہوتا ہے

دیتے۔ اس معاملہ میں صرف فریقین کی رضامندی ضروری ہوتی ہے۔ اس گروپ کے ایک کارکن نے ایک اخباری نمائندے گفتگو کرتے ہوئے کہا "آپ نے جنس کو فروخت ہونے والی ایک اشیاء کا درجہ دے دیا ہے جس کے پاس مال ہے وہ اسے خرید سکتا ہے اجس کے پاس خریدنے کے لئے روپیہ نہیں وہ زندگی بھر محروم رہتا ہے۔ ہمارے یہاں مرد اور عورت کو ایک دوسرے سے قریب آنے کے لئے رضامندی کی ضرورت ہوتی ہے ایک نوجوان کا یہ اعلان ہی کافی ہے کہ وہ کس لڑکی کو پسند کرتا ہے۔ صرف پرانے جوڑے کو علیحدہ رہنے کی اجازت ہوتی ہے"

ویتھرمینوں کے بارے میں ایک سروے کیا گیا جس کے مطابق تقریباً تمام نوجوان لڑکے اور لڑکیاں مکھ پتی اور کروڑپتی خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔ بیل آئرز، کا باپ تھومس آئرز ایک کروڑپتی آدمی ہے اور کامن ویلتھ اینڈ لیبن، شکاگو بجلی کمپنی کا صدر ہے۔ بل آئرز اپنے دوسرے ساتھیوں کی طرح اسکول بھیجا گیا۔ وہ غیرمعمولی ذہین ثابت ہوا۔ اس کا تعلیمی ریکارڈ بہت اچھا رہا۔ اس کے بعد وہ سوسائٹی کو تباہ کرنے والے گروپ میں شامل ہو گیا۔ اس نے مشینی گن کے ایک علاقہ این آربر میں ویتھرمن کی ایک شاخ قائم کی۔ اس کا نام 'دی آپ' رکھا اس گروپ کے کارکنوں کی تصویریں دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ بیشتر ارکان کی عمر ۲۰ سال کی ہے 'ان کے پاس رائفلیں ہوتی ہیں اور سنگین کے ساتھ گیٹار بندھا ہوتا ہے۔

۸۔ اکتوبر کو اس گروپ نے ایک چار روزہ ملک گیر مہم شروع کی تھی۔ جس میں انہوں نے فوجیوں سے کہا کہ وہ اپنے افسروں کے خلاف ہتھیار بلند کرلیں شکاگو کی سڑکوں پر پولیس سے لڑائی کی جائے اسکول کی عمارتوں پر ویت نام کا پرچم لہرایا جائے۔ اور ان تمام کارروائیوں کے دوران الجزائر کی انقلابی خواتین کی طرح اپنے منہ سے ای ای ای یا یا یا یا۔ یا کا نعرہ بلند کرتے رہیں"۔

گرفتار ہونے والوں میں کیتھی بودین اور کیتھلائن ویکرسن شامل تھیں کیتھی کو اقدام قتل کے جرم میں گرفتار کیا گیا اسے دس ہزار پاؤنڈ کی ضمانت پر رہا کیا گیا۔ اس کا باپ ایک مشہور قانون دان ہے اس نے خود اپنی بیٹی کی ضمانت لی۔

کیتھی نے فلاڈلفیا کے سب سے اعلیٰ اور شاندار اسکول میں تعلیم حاصل کی۔ اسکول کی تعلیم کے بعد وہ برائن ماور کالج میں داخل ہوئی کیتھلائن ولکرسن اس کی انقلابی دوست ہے اس کی عمر ۲۶ سال کی ہے۔ وہ جیمس پلاٹ ولکرسن کی لڑکی ہے۔ جو چار ریڈیو اسٹیشنوں کے مالک ہونے کے علاوہ ایڈورٹائزنگ ایگزیکیٹو بھی ہے۔ اس نے سوار تھمور کے ایک ایسے کالج میں تعلیم حاصل کی جہاں

> اُن کے دل میں
> سوسائٹی کے خلاف
> نفرت کی آگ
> دہکتی ہے

داخلہ کی دس درخواستوں میں سے ایک درخواست پر غور کیا جاتا ہے۔

یہ عجیب و غریب عادات واطوار اور حرکات و سکنات کے نوجوانوں پر مشتمل ایک پراسرار تنظیم ہے اس کی ممبرشپ کے بارے میں کسی کو کچھ پتا نہیں۔ ان کے منشور میں کہا گیا ہے"۔ ہم لوگ اس ملک میں تشدد کا واحد ذریعہ ہیں انقلابی راہِ عمل اختیار کرنے میں تشدد کرنا ہی پڑتا ہے ہم بموں کا دھماکہ کریں گے۔ اور خنزیروں کو صفحہ ہستی سے مٹادیں گے وہ وقت آگیا کہ ہم مسلح حملوں سے موجودہ حکومت اور سوسائٹی سے ٹکر لیں"۔

شکاگو میں ویتھرمینوں کے ہیڈکوارٹر میں نیویارک پولیس ہیڈکوارٹر کو بم سے اڑا دینے کا ایک منصوبہ بنایا گیا۔ ہدایات جاری کر دی گئیں مگر بعد میں کسی طرح یہ راز فاش ہو گیا اور بے شمار گرفتاریاں عمل میں آئیں ایک مرتبہ ویتھرمین ہیڈکوارٹر سے ہدایات جاری کی گئیں کہ وہ فرصت کے اوقات میں تفریح میں حصہ لے سکتے ہیں۔

ایک دوسرے موقع پر نیویارک کے ایک کروڑپتی کے گھر کو بم سے اڑانے کا منصوبہ بنایا گیا۔ اس کام کے لئے انقلابیوں کی ایک پارٹی ترتیب دی گئی جس میں کیتھی ولکرسن کے علاوہ ایک نوجوان لڑکی ڈیانا اوٹن بھی شامل تھی۔ کہا جاتا اس کی زندگی رولز رائس کی طرح تھی۔ اس کے دادا نے امریکن بوائے اسکاؤٹ کی تحریک کی بنیاد رکھی تھی۔ اس کا باپ ایک بنک اور کئی کمپنیوں کا مالک ہے مگر وہ ابتدا ہی سے امیرانہ ٹھاٹ باٹ اور عیش و عشرت کی زندگی سے نفرت کرتی تھی وہ ویتھرمین تحریک میں شامل ہو گئی۔

۶۔ مارچ کی ایک اندھیری رات کو ویتھرمین کے چھ کارکن ایک چھوٹے سے کمرے میں نیویارک کے ایک اداکار ڈسٹن ہوف مین کے گھر کو بم سے اڑانے کا عہد کر رہے تھے۔ اس ٹیم میں ڈیانا اوٹن بھی شامل تھی بیکس بدقسمتی سے بم رکھنے کی جگہ اور ٹائمنگ میں کچھ غلطی ہو گئی، اداکار کی رہائش گاہ کا اگلا حصہ دھماکہ سے اڑا اور اس کی کھڑکیاں دروازے اور چھت سامنے والی سڑک پر آگری جس میں ویتھرمین اور تین کارکن بھی دب کر ہلاک ہو گئے۔ مرنے والوں میں حسین لڑکی ڈیانا اوٹن بھی شامل تھی۔

امریکی پولیس نے سوسائٹی کے باغی گروپ سے تعلق رکھنے والے انقلابیوں کو گرفتار کرنے کے لئے پورے ملک میں اپنا جال پھیلا دیا ہے۔ جو گرفتار ہوتے ہیں ان پر بے پناہ تشدد کیا جاتا ہے۔ جو گرفتار نہیں ہوتے اور ابھی بے شمار کارکن گرفتار نہیں ہوئے "تشدد کی تبلیغ کرتے ہیں اور مرتے ہوئے سماج کے خنزیروں کے لئے موت کی سزا تجویز کرتے ہیں"۔

برطانیہ بمقابلہ روس

۱۰۵ روسی سفارتی افسروں کا اخراج

روس کے لیے بہت بڑا صدمہ

زرژنسکی کا مجسمہ، کے جی بی کا ہیڈکوارٹر

نعیم آروی

یہ لندن کی اسٹریٹ مارلبروز ہے۔ یہاں ایک مجسٹریٹ کی عدالت کے باہر بے شمار اخباری نمائندے شدید بے چینی کے عالم میں ٹہل رہے ہیں۔ انہیں ایک گرما گرم سنسنی خیز اور غیر معمولی اہمیت کی حامل خبر کا انتظار ہے۔ چند لمحوں کے بعد انہیں بتایا گیا ”سوویت ٹریڈ افسر اولیگ لیالن“ عمر ۳۴ — مندرجہ ذیل لگائے گئے الزامات کا تسلی بخش جواب دینے میں ناکام رہا۔

(الف) نشہ کے عالم میں گاڑی چلا رہا تھا۔

(ب) لندن کے نواحی علاقے کے ایک آرام دہ مکان میں چند ہفتوں سے قیام پذیر تھا۔ برطانوی انٹیلی جنس کے مطابق وہ ان ایام میں سوویت یونین کے لئے جاسوسی کرتا رہا۔ برطانوی حکومت اس کی سرگرمیوں سے باخبر تھی، چنانچہ اس کی روک تھام کے لئے برطانیہ میں مقیم ۵۵۰ روسی سفارتی افسروں میں سے ۱۰۵ سفارتی افسروں کو فوری طور پر برطانیہ سے نکل جانے کا حکم دیا گیا۔

اس واقعہ سے روس اور برطانیہ، دونوں ملکوں میں ایک ہنگامہ اٹھ کھڑا ہوا۔ برطانیہ نے اس سے قبل اتنا بڑا قدم کبھی نہیں اٹھایا تھا۔ دونوں ملکوں کے تعلقات بڑے دوستانہ ہیں۔

پچھلے چند سالوں سے روس نے مغربی یورپ، برطانیہ اور امریکہ سے تجارتی اور سیاسی تعلقات کے بہانے دوستی کی خوب پینگیں بڑھا لی تھیں، پھر اچانک اتنا بڑا واقعہ کیسے رونما ہو گیا کہ برطانوی سیکرٹری خارجہ ڈگلس ہیوم سوویت یونین کا دورہ منسوخ کرنے پر مجبور ہو گئے۔ کسی ملک سے ۱۰۵ سفارتی نمائندوں کا اخراج کوئی ایسا معمولی واقعہ بھی نہیں جسے نظر انداز کر دیا جائے۔ سوویت کمیونسٹ پارٹی کے لیڈر (سیکرٹری) ایل، برزنیف یوگوسلاویہ کا تین روزہ دورہ کر کے جب ماسکو پہنچے تو ونوکوو ایئرپورٹ پر پندرہ ارکان پر مشتمل پولٹ بیورو کی ہنگامی میٹنگ طلب کر لی۔ یہ ایک اعلیٰ سطح کی کانفرنس تھی۔ جس میں برطانیہ کے اس اقدام کا جائزہ لیا گیا۔ اس اجلاس کی وجہ سے بھارتی وزیراعظم مسز اندرا گاندھی کے اعزاز میں دیئے گئے سرکاری ڈنر میں ۲۴ گھنٹے کی تاخیر ہو گئی۔

ادھر مین ہٹن میں برطانوی سیکرٹری خارجہ سر ایلیس ڈگلس ہیوم نے روسی وزیر خارجہ اندرے گرومیکو سے ۸۰ منٹ تک باہمی دلچسپی کے امور پر بات چیت کی۔ گفتگو کے دوران سر ایلیس ہیوم نے کہا ”ہم بھی کچھ کر سکتے تھے۔ اس طرح دونوں ملکوں کے درمیان دوستی اور خیر سگالی کی راہ میں آنے والی رکاوٹ دور کر دی گئی۔“

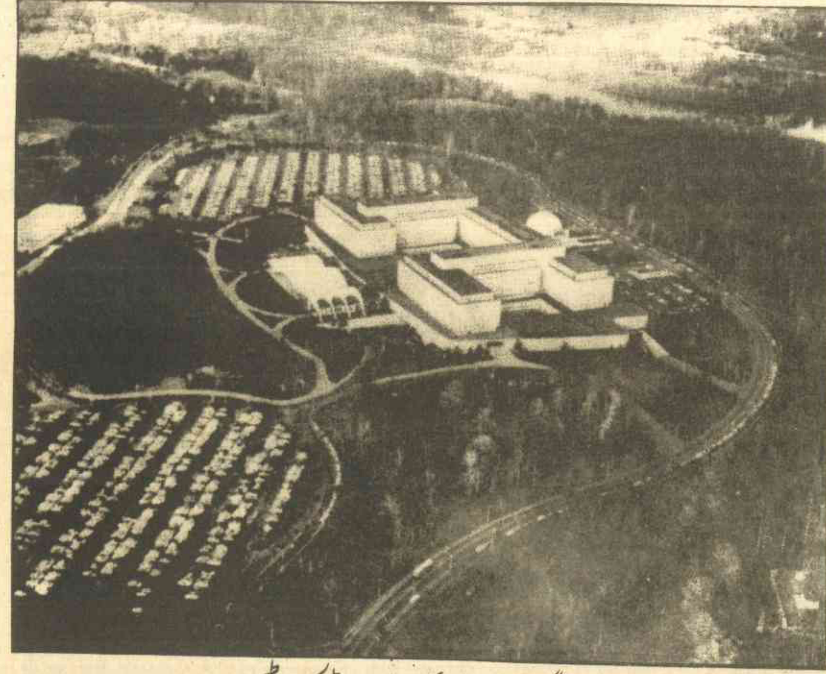
کہا جاتا ہے کہ گرومیکو نے مسکرا کر جواب دیا ”تعلقات بہتر کرنے کا کیا خوب طریقہ نکالا گیا۔“

گرومیکو نے کہا ”ماسکو اس جبری اخراج پر اپنا ردعمل ظاہر کرے گا۔“

دفتر خارجہ کے ایک افسر نے جواب دیا۔ ”برطانیہ میں اب بھی روس کے ۴۴۵ سفارتی افسر موجود ہیں۔“ برطانیہ کی جانب سے یہ ایک کھلی ہوئی دھمکی تھی۔ روس کے سامنے دو ہی راستے تھے۔ خاموشی۔ یا پھر ماسکو میں مقیم برطانوی سفارتی نمائندوں کے خلاف جوابی کارروائی۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد برطانیہ اور امریکہ نے اس خطرناک کھیل کی تکنیک میں حیرت انگیز ترقی کی ہے۔ اس سلسلے میں سی آئی اے کا ذکر بارہا آ چکا ہے۔ اس بدنام امریکی ادارہ کے بے شمار ایجنٹ غیر ملکی سفارتی نمائندوں کی حیثیت سے کام کرتے رہے ہیں۔ برطانیہ میں مقیم روسی سفارتی افسروں پر لگائے گئے جاسوسی کے الزام میں کہاں تک صداقت ہے۔ اس کے بارے میں کوئی بات پورے وثوق سے نہیں کہی جا سکتی۔ البتہ بیک وقت ۱۰۵ روسی سفارتی نمائندوں کے اخراج کے پس پشت سیاسی عوامل یقیناً کارفرما ہیں۔ کچھ مبصرین کا یہ بھی خیال ہے کہ روس ابھاریڈزیم پسندی کی راہ پر چل نکلنے کے بعد سامراجی ملکوں سے اصولی اور نظریاتی میدان میں کھل کر دو دو ہاتھ کرنے کی بجائے وہی ہتھکنڈے استعمال کر رہا ہے جو عام طور پر سامراج اور سامراج نواز ممالک استعمال کرتے ہیں۔

ان دنوں امریکہ اور روس دونوں ”خلائی جاسوسی“ کی تکنیک میں حیرت انگیز تجربے کر رہے ہیں۔ دونوں کا

تین روسی ایجنٹوں نے نیٹو کے خفیہ اڈے سے ایک میزائل غائب کر کے ماسکو پہنچا دیا۔



لنگلے میں سی آئی اے کا ہیڈ کوارٹر

مقصد ایک ہی ہے ایک دوسرے کے خلائی تجربات کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کی جائیں۔ دونوں ملک نے خلا میں جاسوسی کرنے والے سیارے پہنچا دیئے ہیں، جو ایک دوسرے کے سیارے کی تصویریں بھیجتے رہتے ہیں۔ ایک برطانوی ماہرین کا کہنا ہے کہ تصویر کے ذریعہ جدید طیارے کا پتا لگ جاتا ہے لیکن اس کے انجن اور اندرونی مشینری کی کارکردگی کے بارے میں معلومات حاصل کرنا بہت مشکل ہے۔

سوویت یونین کے محکمہ جاسوسی کا نام کے جی بی ہے سوویت کمیٹی فار اسٹیٹ سیکورٹی۔ اس ادارہ میں کام کرنے والے کو کے جی بی مین کہا جاتا ہے۔ مشرقی یورپ کی ٹرینوں پر سفر کرتے ہوئے ملیں گے۔ سیاہ سوٹ میں ملبوس، ان کے لباس سے خوشبو کی دھیمی دھیمی لپٹیں اٹھتی ہیں، بے حد اسمارٹ اور خوش اخلاق۔ اس کے برعکس سی آئی اے والے خرید و فروخت کے ایجنٹ معلوم ہوتے ہیں انہیں دیکھنے سے محسوس ہوگا جیسے وہ کسی کاروباری کانفرنس کے اکتا دینے والے اجلاس میں شرکت کرنے جا رہے ہیں۔

کے جی بی کے کارکن عام طور پر بے حد مہذب، اور سلجھے ہوئے ذہن کے مالک ہوتے ہیں۔ وہ بیک وقت کئی غیر ملکی زبانوں پر ماہرانہ عبور رکھتے ہیں گفتگو کے دوران شائستگی اور صبر و ضبط کا مظاہرہ کرتے ہیں،

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ برطانیہ جیسے طفیلی ملک میں روسی جاسوس کسی چیز کی تلاش میں تھے۔ انہیں اگر کسی چیز کی تلاش تھی تو وہ یقیناً، امریکہ ہی میں مل سکتی تھی پھر بھلا وہ برطانیہ میں کیا کرتے پھر رہے تھے۔ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے برطانوی دفتر خارجہ کے ایک اعلیٰ افسر نے کہا۔ "انہیں معلوم ہے کہ ہمارے اور امریکہ کے درمیان گہرے مراسم ہیں۔ برطانیہ واحد ملک ہے جو امریکہ کی جوہری معلومات سے آگاہ ہے"

برطانیہ نے اوبگ لیالن پر الزام لگایا کہ اس کی تحویل سے جو خفیہ دستاویزات برآمد کیے گئے ہیں۔ ان میں ۔ برطانیہ میں وارننگ سسٹم، اور ارفورڈ کے میزائل کے اڈے کے بارے میں خفیہ کاغذات شامل ہیں جسے امریکہ نے تعمیر کیا تھا

اوبگ لیالن کی گرفتاری کے ایک ہفتہ بعد تک اس کی شخصیت پر راز کا پردہ پڑا رہا۔ ڈیلی ایکسپریس نے ۳۱۔ اگست کو لیالن کی گرفتاری اور ضمانت پر رہائی کی ایک دس سطری خبر شائع کی۔ دو گھنٹوں کے بعد لیالن عدالت کے مقررہ وقت پر پہنچنے میں ناکام رہا دفتر خارجہ نے اس خبر کی تصدیق کر دی کہ اس کا تعلق روسی سفارت خانہ سے ہے۔ ابتدا میں اس خبر کو جان بوجھ کر خفیہ رکھا گیا۔ بعد میں اس کی خوب تشہیر کی گئی تاکہ اس واقعہ سے سیاسی فائدہ اٹھایا جائے اوبگ شادی شدہ ہے۔ اس کی بیوی اور ایک سات سالہ لڑکا ماسکو میں ہے، برطانوی اخبارات اس کے متعلق عجیب و غریب خبریں شائع کر رہے ہیں اوبگ اور ایک روسی خاتون ارینا تپتیلیا کو ایک ماہ سے لندن کے ریستورانوں اور نائٹ کلبوں میں دیکھے جا رہے تھے۔ اس کے متعلق یہ بھی انکشاف کیا گیا کہ وہ کے جی بی میں کیپٹن ہے۔

برطانوی سیکرٹری خارجہ ڈگلس ہیوم نے ۳۔ دسمبر اور اس کے بعد ۱۴۔ اگست کو روسی وزیر خارجہ گرومیکو کو مراسلہ بھیجا تھا، جس میں اس بات پر سخت تشویش ظاہر کی گئی تھی کہ لندن میں سوویتی جاسوسوں کی سرگرمیاں بڑھ گئی ہیں۔ معلوم ہوا کہ ان دونوں مراسلوں کا کوئی جواب موصول نہیں ہوا برطانیہ نے یہ بھی الزام لگایا کہ سوویت یونین فرسٹ سیکرٹری کی حیثیت سے کے جی بی کے ایک ایجنٹ کو لندن بھیج رہا تھا جسے تین سال قبل برطانیہ سے جاسوسی کے الزام میں نکال دیا گیا تھا۔ روسی سفارتی نمائندوں کو برطانیہ سے نکالنے کے لئے ایک اعلیٰ سطحی کانفرنس ہوئی تھی جس میں وزیر اعظم ایڈورڈ ہیتھ ڈگلس ہیوم وزیر دفاع لارڈ کیرنگٹن اور سیکرٹری داخلہ ریگنالڈ ماؤلڈنگ شریک ہوئے تھے۔

برطانیہ کے اس اقدام پر کچھ لوگوں نے رائے دیتے ہوئے کہا "بوڑھا اور کمزور شیر ابھی دھاڑنے کی قوت رکھتا ہے"

غیر جانبدار مبصرین برطانیہ کے اس اقدام کو ناپسندیدگی کی نظروں سے دیکھ رہے ہیں، ان کا خیال ہے، ٹوری حکومت اپنی گرتی ہوئی ساکھ کو سنبھالا دینے کے لئے روس جیسے بڑے ملک کے خلاف انتہائی گھٹیا حربے استعمال کر رہی ہے "ٹوری حکومت یورپی سیکورٹی کانفرنس کو تارپیڈو کرنا چاہتی ہے"۔

اندرا گاندھی کے اعزاز میں دیا گیا عشائیہ ۲۴ گھنٹے لیٹ ہو گیا

برطانوی حکومت اپنے آپ کو حق بجانب ثابت کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہی ہے۔ برطانوی اخبارات روسی نمائندوں کو جاسوس ثابت کرنے کے لئے گھٹیا ہتھکنڈے استعمال کر رہے ہیں انہیں شرابی لاپرواہ اور نائٹ کلبوں کا رسیا کہا جا رہا ہے۔ یہ ساری مہم محض اس لئے جاری ہے کہ برطانیہ سے بیک وقت ۱۰۵ روسی سفارتی نمائندوں کے اخراج کو جائز اور صحیح اقدام ثابت کیا جا سکے۔

دوسری طرف ماسکو نے پہلے مرحلہ میں اپنا ردعمل ظاہر کر دیا ہے۔ سرکاری اخبار پراودا نے برطانیہ پر الزام لگایا ہے۔ کہ برطانوی انٹیلی جنس، برطانوی تاجروں، سیاحوں طلبا اور سائنسدانوں کو ماسکو میں بھیج کر ان سے جاسوسی کا کام لیتی ہے۔ ۱۹۶۳ء میں برطانوی جاسوس کم فلبی پکڑا گیا تھا۔ جس نے ایسے ۲۰ سفارتی نمائندوں کے نام بتائے تھے، جو سوویت یونین اور مشرق وسطیٰ میں جاسوسی کا کام کر رہے تھے۔

کے۔ جی۔ بی کا ہیڈ کوارٹر ماسکو کے وسط میں زرزنگسی اسکوائر میں واقع ہے۔ اس کے ایک کنارے کتابوں کی ایک بہت بڑی دکان ہے اس جگہ ایسی کوئی علامت یا نشان نہیں ہے۔ جس سے معلوم ہو سکے کہ یہ سوویت سیکرٹ پولیس کا دفتر ہے اس کے سامنے سوویت سیکرٹ پولیس "فیلکس ای زرزنگسی" کا ایک بہت بڑا مجسمہ نصب ہے، اس محکمہ کے سربراہ کا نام یوری اندرے پوپ ہے، ان کی عمر ۵۷ سال کی ہے یوری اندرے پوپ ۱۹۵۶ء میں ہنگری کے سفیر بھی رہ چکے ہیں، اس محکمہ کے بجٹ کے بارے میں کسی کو علم نہیں۔ سی آئی اے امریکہ کا ایک انتہائی طاقتور ادارہ ہے، اس کے اخراجات لامحدود ہیں، صرف واشنگٹن میں اس ادارہ میں پندرہ ہزار افراد کام کرتے ہیں، باہر کے ملکوں میں

روسی جاسوس بے حد اسمارٹ اور خوشبو میں معطر رہتے ہیں

اس ادارے کے ایجنٹوں کی تعداد کا پتہ لگانا مشکل ہے کیونکہ جہاں بھی امریکی سفارت خانے کام کر رہے ہیں وہاں سی آئی اے کے ایجنٹ سفارتی نمائندوں کی حیثیت سے موجود ہیں۔

سی آئی اے اور کے جی بی کے ایجنٹ اپنے اپنے ملکوں کے لئے جاسوسی کا کام انجام دیتے ہیں اور دوسرے ملکوں کے بارے میں خفیہ اور قیمتی معلومات فراہم کرتے ہیں، دونوں اداروں کے حصے میں کامیابیاں اور ناکامیاں آئی ہیں۔ سی آئی اے کے ایجنٹ روس کی فوجی طاقت، اور جوہری ہتھیاروں کے متعلق معلومات حاصل کرنے میں زیادہ دلچسپی لیتے ہیں، سی آئی اے اور کے جی بی میں کسی حد تک مماثلت ہے۔ تو واضح تضاد بھی موجود ہے۔ سی آئی اے کے ایجنٹ، پس ماندہ اور ترقی یافتہ ملکوں کو امریکہ کی گرفت میں رکھنے کے لئے خطرناک اور مذموم ہتھکنڈے استعمال کرتے ہیں، ترقی پسند ملکوں کی حکومتوں کا تختہ الٹ کر من پسند افراد کو برسراقتدار لاتے ہیں۔ عوامی ابھار کو کچلنے کے لئے رجعت پسندوں کو اسلحہ اور ڈالر دیتے ہیں اور وہ خود ان کے ساتھ مل کر عوام دوست رہنماؤں اور ترقی پسندوں کو اغوا اور قتل کرنے میں براہ راست حصہ لیتے ہیں۔ اس کے برعکس کے جی بی کے ایجنٹ ایسے کام میں ہاتھ نہیں لگاتے، ان کا مرکزی کام سامراجی ملکوں کی فوجی ترقی کی رفتار اور جوہری ہتھیاروں کے بارے میں معلومات حاصل کرنا ہے اور سی آئی اے ایجنٹوں کے منصوبے کو ناکام بنانا ہے۔

۱۹۶۷ء میں کے جی بی کے تین ایجنٹوں نے نیٹو کے خفیہ اڈے زیل سے ایک میزائل غائب کر کے ماسکو پہنچا دیا تھا۔ لوگوں کو اس بات پر مشکل سے یقین آئے گا مگر یہ ایک حقیقت ہے

برطانوی مبصرین کا خیال ہے کہ روس اور امریکہ سیاسی معاملات میں ایک دوسرے سے تعاون کر رہے ہیں۔ چند سالوں سے یہ دونوں بڑے ملک ایک دوسرے سے بہت قریب آ گئے ہیں۔ چنانچہ اس بات کے امکان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ کے جی بی اور سی آئی اے کے درمیان بھی رابطہ قائم کر دیا جائے اور کسی تیسرے ملک کے خلاف جس سے روس اور امریکہ دونوں خائف ہیں مل کر کام کرنا شروع کر دیں۔



کے جی بی کے چیف اندروپو

"الفتح" اور آپ کی رائے

"الفتح" آپ کا اپنا پرچہ ہے اور ہم آپ کی رائے کو وقیع تر سمجھتے ہیں۔ اس پرچے کی افادیت میں ہم اور بھی اضافہ کر سکتے ہیں اگر آپ مشورہ دیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہم ہے سر پر جو کوششیں کرتے ہیں اس کے متعلق آپ کی رائے بھی جان لیں۔ ہمارے ہاں جو مستقل سلسلے شروع ہیں اس کے بارے میں ہم جاننا چاہتے ہیں کہ انہیں جاری رکھا جائے یا ختم کر دیا جائے اور اگر جاری رکھا جائے تو ان میں کس قسم کے اضافے کی ضرورت ہے۔ آپ کو کونسا سلسلہ سب سے زیادہ پسند ہے؟ آپ مندرجہ ذیل موضوعات کے بارے میں اپنی رائے الگ کسی پرچے پر لکھ کر بھجوا دیں۔

۱ - ظاہری خبریں اندرونی کہانیاں	۲ - سنو آواز آ رہی ہے
۳ - پردہ چاک	۴ - سرمایہ دار معاشرے کا دوسرا رخ
۵ - ضیاء سرحدی کی یادداشتیں	۶ - ہنزہ سے چاٹگام
۷ - ۲۲ خاندان	۸ - روزنامہ غالب سے روزنامہ جنگ تک

اندرا گاندھی کے اعزاز میں دیا گیا عشائیہ ۲۴ گھنٹے لیٹ ہو گیا

برطانوی حکومت اپنے آپ کو حق بجانب ثابت کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہی ہے۔ برطانوی اخبارات روسی نمائندوں کو جاسوس ثابت کرنے کے لئے گھٹیا ہتھکنڈے استعمال کر رہے ہیں انہیں شرابی لاپرواہ اور نائٹ کلبوں کا رسیا کہا جا رہا ہے یہ ساری مہم محض اس لئے جاری ہے کہ برطانیہ سے بیک وقت ۱۰۵ روسی سفارتی نمائندوں کے اخراج کو جائز اور صحیح اقدام ثابت کیا جا سکے۔

دوسری طرف ماسکو نے پہلے مرحلہ میں اپنا ردعمل ظاہر کر دیا ہے۔ سرکاری اخبار پراودا نے برطانیہ پر الزام لگایا ہے۔ کہ برطانوی انٹیلی جنس، برطانوی تاجروں، سیاحوں طلبا اور سائنسدانوں کو ماسکو میں بھیج کر ان سے جاسوسی کا کام لیتی ہے۔ ۱۹۶۳ء میں برطانوی جاسوس کم فلبی پکڑا گیا تھا۔ جس نے ایسے ۲۰ سفارتی نمائندوں کے نام بتائے تھے، جو سوویت یونین اور مشرق وسطیٰ میں جاسوسی کا کام کر رہے تھے۔

کے۔جی۔بی کا ہیڈ کوارٹر ماسکو کے وسط میں زرزنگسی اسکوائر میں واقع ہے۔ اس کے ایک کنارے کتابوں کی ایک بہت بڑی دکان ہے اس جگہ ایسی کوئی علامت یا نشان نہیں ہے۔ جس سے معلوم ہو سکے کہ یہ سوویت سیکرٹ پولیس کا دفتر ہے اس کے سامنے سوویت سیکرٹ پولیس "فیلکس ای زرزنگسی" کا ایک بہت بڑا مجسمہ نصب ہے، اس محکمہ کے سربراہ کا نام یوری اندرے پوپ ہے، ان کی عمر ۵۷ سال کی ہے یوری اندرے پو ۱۹۵۶ء میں ہنگری کے سفیر بھی رہ چکے ہیں۔ اس محکمہ کے بجٹ کے بارے میں کسی کو علم نہیں۔ سی آئی اے امریکہ کا ایک انتہائی طاقتور ادارہ ہے، اس کے اخراجات لامحدود ہیں۔ صرف واشنگٹن میں اس ادارہ میں پندرہ ہزار افراد کام کرتے ہیں، باہر کے ملکوں میں

روسی جاسوس بے حد اسمارٹ اور خوشبو میں معطر رہتے ہیں

اس ادارے کے ایجنٹوں کی تعداد کا پتہ لگانا مشکل ہے کیونکہ جہاں بھی امریکی سفارت خانے کام کر رہے ہیں وہاں سی آئی اے کے ایجنٹ سفارتی نمائندوں کی حیثیت سے موجود ہیں۔

سی آئی اے اور کے جی بی کے ایجنٹ اپنے اپنے ملکوں کے لئے جاسوسی کا کام انجام دیتے ہیں اور دوسرے ملکوں کے بارے



کے جی بی کے چیف اندروپو

میں خفیہ اور قیمتی معلومات فراہم کرتے ہیں، دونوں اداروں کے حصے میں کامیابیاں اور ناکامیاں آئی ہیں۔ سی آئی اے کے ایجنٹ روس کی فوجی طاقت، اور جوہری ہتھیاروں کے متعلق معلومات حاصل کرنے میں زیادہ دلچسپی لیتے ہیں، سی آئی اے اور کے جی بی میں کسی حد تک مماثلت ہے۔ تو واضح تضاد بھی موجود ہے۔ سی آئی اے کے ایجنٹ، پس ماندہ اور ترقی یافتہ ملکوں کو امریکہ کی گرفت میں رکھنے کے لئے خطرناک اور مذموم ہتھکنڈے استعمال کرتے ہیں، ترقی پسند ملکوں کی حکومتوں کا تختہ الٹ کر پٹھو افراد کو برسر اقتدار لاتے ہیں۔ عوامی ابھار کو کچلنے کے لئے رجعت پسندوں کو اسلحہ اور ڈالر دیتے ہیں اور وہ خود ان کے ساتھ مل کر عوام دوست رہنماؤں اور ترقی پسندوں کو اغوا اور قتل کرنے میں براہ راست حصہ لیتے ہیں۔ اس کے برعکس کے جی بی کے ایجنٹ ایسے کام میں ہاتھ نہیں لگاتے ان کا مرکزی کام سامراجی ملکوں کی فوجی ترقی کی رفتار اور جوہری ہتھیاروں کے بارے میں معلومات حاصل کرنا ہے اور سی آئی اے ایجنٹوں کے منصوبے کو ناکام بنانا ہے۔

۱۹۶۷ء میں کے جی بی کے تین ایجنٹوں نے نیٹو کے خفیہ اڈے زیل سے ایک میزائل غائب کر کے ماسکو پہنچا دیا تھا۔ لوگوں کو اس بات پر مشکل سے یقین آئے گا مگر یہ ایک حقیقت ہے

برطانوی مبصرین کا خیال ہے کہ روس اور امریکہ سیاسی معاملات میں ایک دوسرے سے تعاون کر رہے ہیں۔ چند سالوں سے یہ دونوں بڑے ملک ایک دوسرے سے بہت قریب آ گئے ہیں۔ چنانچہ اس بات کے امکان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ کے جی بی اور سی آئی اے کے درمیان بھی رابطہ قائم کر دیا جائے اور کسی تیسرے ملک کے خلاف جس سے روس اور امریکہ دونوں خائف ہیں مل کر کام کرنا شروع کر دیں۔

"الفتح" اور آپ کی رائے

"الفتح" آپ کا اپنا پرچہ ہے اور ہم آپ کی رائے کو وقیع تر سمجھتے ہیں۔ اس پرچے کی افادیت میں ہم اور بھی اضافہ کر سکتے ہیں اگر آپ مشورہ دیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہم جن امور پر جو کوششیں کرتے ہیں اس کے متعلق آپ کی رائے بھی جان لیں۔ ہمارے ہاں جو مستقل سلسلے شروع ہیں اس کے بارے میں ہم جاننا چاہتے ہیں کہ انہیں جاری رکھا جائے یا ختم کر دیا جائے اور اگر جاری رکھا جائے تو ان میں کس قسم کے اضافے کی ضرورت ہے۔ آپ کو کونسا سلسلہ سب سے زیادہ پسند ہے؟ آپ مندرجہ ذیل موضوعات کے بارے میں اپنی رائے الگ کسی پرچے پر لکھ کر بھجوا دیں۔

۱۔ ظاہری خبریں اندرونی کہانیاں
۲۔ سنو آواز آ رہی ہے
۳۔ پردہ چاک
۴۔ سرمایہ دار معاشرے کا دوسرا رخ
۵۔ ضیاء سرحدی کی یادداشتیں
۶۔ ہنزہ سے چاٹگام
۷۔ ۲۲ خاندان
۸۔ روزنامہ غالب سے روزنامہ جنگ تک



ٹی وی کی ایک شخصیت سے ملنے کے بعد "الفتح" دوسری شخصیت سے ملوانے کا وعدہ کچھ تاخیر کے بعد پورا کر رہا ہے۔ ہمارے "رازدل" ان شخصیتوں کے متعلق مزید کچھ جاننے کے لئے ٹیلی ویژن کے طلسم کدہ میں گھوم رہے تھے۔ اور وہ اس بحرِ ذخار میں غوطہ خوری کے بعد جو موتی نکال لائے ہیں وہ "الفتح" کے صفحات پر قارئین کے لئے بکھیرے جا رہے ہیں۔ بتایئے! کیسا رہا یہ سلسلہ؟ (ادارہ)

ٹی۔ وی میں جانے والی شریف لڑکیو!

ٹیلی ویژن کے راجہ اندر سے ہوشیار

ٹی وی کے (GLAMOUR) گلیمر سے متاثر ہو کر شریف زادیاں راتوں رات شہرت حاصل کرنے یا مناسب شوہر کی تلاش میں اس کے دروازوں پر دستک دیتی ہیں دروازے ایک شیطانی مسکراہٹ کے ساتھ فوراً کھل جاتے ہیں چند دن تک ایک ہی صورت ہر جگہ نظر آتی ہے اور پھر نئی دستک، نئے ڈرامے نئی ہیروئن یہ روز کا معمول ہے۔

بند کمروں کے اندر جو ڈرامے کھیلے جاتے ہیں ان کے گواہ بے چارے وہ چپراسی ہیں جن کی غیرت پر دورِ وقت کی روٹی کی مہر لگی ہوئی ہے ان دروازوں کو کھولنے اور بند کرنے میں نجانے کتنی بار ان کی روح چکلی جاتی ہے۔ نجانے کتنی بار انہیں خود اپنی نظروں میں ذلیل ہونا پڑتا ہے۔

یہ سارا کھیل جنرل مینجر کی نظروں کے سامنے بھی دوہرایا جاتا ہے۔ وہ بوڑھے شیر کی طرح یادِ رفتگاں میں کھو کر اپنی مخصوص انگریزی مسکراہٹ سے دائیں ہاتھ کا انگوٹھا اٹھا کر اس کی داد دیتے ہیں

اگر ٹیلی ویژن سٹیشن کو راجہ اندر کا اکھاڑا کہا جائے تو راجہ اندر کا تاج بلا شرکت غیرے پروگرام مینجر جناب زمان علی خان صاحب کے سر پر رکھا جائے گا

درمیانہ قد کھلتی ہوئی رنگت دیکھنے میں اپنی عمر سے کم از کم دس سال چھوٹے قلمیں اور سر کے بال موجودہ فیشن کے عین مطابق بقول شخصے دل کے ہاتھوں اس قدر بے بس کہ اگر دور کسی جھاڑی پر دوپٹہ یا ساڑھی ڈال دی جائے تو اپنی کار کے ٹائروں سے آس پاس کی زمین پر ہل چلا دیں۔ ان کی بارہ سالہ پرسکون شادی شدہ زندگی اور ایک ہونہار بچہ

ٹیلی ویژن کی نوکری پارٹ ٹائم کام ہے

ابھی ابھی ان کے اس شوق کی تشفی ہوئی ہے۔ میری مراد فلم سٹار رلیشیاں اور ان کے صاحب زادے سے ہے۔ حال ہی میں رلیشیاں نے اخبار میں ایک بیان دیا ہے شاید آپ کی نظر سے بھی گذرا ہو، اس میں انہوں نے ٹیلی ویژن کی دو ملازم خواتین کے نام لے کر زمان علی خان صاحب کو اجازت دی ہے کہ وہ جس سے جی چاہے شادی رچائیں۔

شریف الطبع رلیشیاں نے تو صرف دو ہی نام گنوائے ہیں اور باقی بے شمار کہانیاں اپنی روح کے زخموں میں چھپا لی ہیں۔ آخر کو تھیں تو ایک مشرقی خاتون۔

خاتون اول کا دور تو اب تقریباً ختم ہو چکا ہے وہ ٹی۔ وی سٹیشن کی راہداریوں میں اکثر اپنے تنتے ہوئے چہرے پر دبیز میک اپ کی تہیں سجائے منتظر رہتی ہیں۔ لیکن ان کا یہ انتظار تو اب ابدی ہو گیا ہے۔

خاتون نمبر ۲ ہفتے کے چھ دن تو ڈیوٹی پر ہوتی ہیں اور ساتواں یعنی پیر کا دن زمان صاحب کے ساتھ گذارتی ہیں ٹی۔ وی کے دونوں ملازم پیر کے دن مختلف ہوٹلوں اور پارکوں کی زینت بنتے ہیں جہاں بہت ساری عورتیں اور بچے ان کو پہچان کر ان کے عشق کی داد دیتے ہیں ان پر سربراہ محش حرکات کا کوئی قانون بھی لاگو نہیں ہوتا۔

ٹیلی ویژن کے شروع ایام میں زمان صاحب کو ایک ڈھنگ کا آدمی مل گیا تھا۔ یہ شخص فلمی دُنیا کی ایک بدنام ترین شخصیت ہے۔ اس کی ساری عمر مفت شراب پینے کے چکر میں گذری ہے۔ اس شخص کی تعلیمی حیثیت بالکل صفر ہے لیکن جناب اسلم اظہر اور زمان صاحب نے اسے سکرپٹ پڑھنے اور ٹیلی کاسٹ کے قابل سکرپٹ چننے پر رکھا ہوا تھا۔ آہستہ آہستہ ان کا عمل دخل اتنا بڑھ گیا کہ ایک دن انہوں نے عین زمان صاحب کی موجودگی میں ایک مقامی روزنامے کے نمائندے کو پیٹ ڈالا۔ اخباروں میں شور مچا لیکن جرٹی وی کے سربراہ اور نائب سربراہ کا پروردہ ہو اس پر الزام کیسا؟

ان صاحب کو ایک اور ڈیوٹی تفویض کی گئی۔ اور وہ ڈیوٹی یہ تھی کہ وہ ہر آڈیشن کے لئے آنے والی لڑکی کا نام اور پتہ نوٹ کر لیں۔

پھر رات کی تاریکیوں میں ولایتی شراب سے

پروگرام مینجر

پروگرام بنانے کے

علاوہ سب کچھ

کرتے ہیں

سیر ہو کر زمان صاحب اپنی گاڑی میں بیٹھ کر ان مقامات کی تلاش کرتے پھرتے ہیں ایک دن ناظم آباد میں کسی ایسی ہی خاتون کے غیرت مند باپ نے پستول تان لیا تو زمان صاحب معہ ان حضرت کے ایسے بھاگے کہ ناظم آباد کی دوسری چورنگی پر ایکسیڈنٹ ہوتے ہوتے بچا۔

ایک اور واقعہ سنئے۔

ملک کے ایک ممتاز اور قابل احترام موسیقار کی صاحبزادی جو کئی فلموں میں کام کر چکی ہیں حالات اور وقت کی چکی میں پس رہی تھیں، ان کی بوڑھی والدہ مہینے میں ایک بار ریڈیو سے گاتی تھیں اور جو پیسے ملتے تھے، ان سے زندگی کی گاڑی الٹی سیدھی گھسیٹ رہی تھیں۔

ان کی بد قسمتی انہیں ٹیلی ویژن لے گئی۔ زمان صاحب اور ان کے پروردہ نے خوب آؤ بھگت کی۔ آڈیشن لیا گیا اور انہیں وہیں فٹ قرار دے دیا گیا — اور یہ بھی وعدہ کیا گیا کہ عنقریب کوئی رول جو آپ کے شایان شان ہو پیش کیا جائے گا۔

کچھ عرصہ بعد ان خاتون سے میری ملاقات ہوئی۔ میں نے ٹی وی کے متعلق دریافت کیا تو ان کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔ وہ بالکل خاموش رہیں۔

ان کی والدہ تلخی سے بولیں۔

"کسی کو کیا دوش دوں۔ اپنی مرغی سے ہی صبر نہ ہوا"

اب ٹھیک ڈھائی سال بعد وہ "رات کی آنکھوں" میں سے جھانک رہی ہیں، شاید اب کے انہوں نے سمجھداری سے کام لیا ہو۔

بقول رلیشیاں زمان صاحب خود بُرے آدمی نہیں ہیں ان کے اوباش دوست لے ڈوبے ہیں اور اس کا ثبوت دینے کے لئے ایک بار غصے میں انہوں نے زمان صاحب کے ایک یار غار کے سر پر شراب کی بوتل دے ماری تھی۔

ناظرین کرام!

اب اندازہ لگایئے کہ آپ کو ٹیلی ویژن پر جو کچھ دیکھنے کو ملتا ہے وہ اتنا گھٹیا اور غیر معیاری کیوں ہوتا ہے۔ ٹیلیویژن کی نوکری تو پارٹ ٹائم کام ہے فل ٹائم کام تو دوسری بے شمار مصروفیات ہیں جن سے ٹیلی ویژن کے ارکان کو بہت کم فرصت ملتی ہے اپنے بیکار وجود کو ثابت کرنے کے لئے بعض اوقات کیسی مضحکہ خیز حرکات سرزد ہوتی ہیں۔ اس بات کا اندازہ مندرجہ ذیل واقع سے لگایئے۔

زمان صاحب نے غصے میں آ کر حکم دیا کہ فلاں پروگرام میں پروڈیوس کر رہا ہوں۔

جونیئر پروڈیوسر کی حیثیت ہی کیا۔ خاموشی اختیار کی زمان صاحب نے پروگرام پروڈیوس کیا۔ لیکن وہ اپنی مندرجہ بالا مصروفیات کی بنا پر پروگرام پر پورا وقت اور مناسب توجہ نہ دے سکے۔ ریکارڈنگ پر دیکھا کہ پروگرام حسب معمول معیاری نہیں ہے تو قربانی کے بکرے کی تلاش ہوئی۔ ایک بہت ہی معصوم اور نیک سیرت پروڈیوسر صاحب پر ظلم ڈھایا گیا۔ اور پروگرام پر ان کے نام کی تختی چسپاں کر کے زینت سکرین بنا دیا گیا۔ اور آپ نے یقیناً اس پروگرام کو دیکھ کر اس بے گناہ پروڈیوسر کو گالیاں دی ہوں گی، زمان صاحب اس وقت کسی پارک یا ہوٹل میں بیٹھے اپنی خاتون دوم کو یہ واقع سنا کر ہنس رہے ہوں گے اور مخصوص بنگالی لہجے میں لچھے دار پنجابی گالیاں دے کر اسے محظوظ کر رہے ہوں گے۔

بقیہ: ایرانی عوام کیا چاہتے ہیں؟

لڑائی کی اطلاع دی تھی۔ جس کے پیش نظر ایران میں ڈھائی ہزار سالہ جشنِ شہنشاہیت کے موقع پر سخت حفاظتی اقدامات کئے گئے ہیں۔ اخباری اطلاع کے مطابق مسلح ہیلی کاپٹر شہروں پر گشت کر رہے ہیں۔ تاکہ متوقع خطرے کا مقابلہ کیا جائے۔ یہ تمام واقعات اس بات کا اظہار ہیں کہ ایرانی عوام مغربی ممالک اور ایرانی گماشتہ سرمایہ داروں کے خلاف ہیں۔



غریب بلوچی کا اپنی زمینوں اور پہاڑوں سے اب بھی وہی رشتہ ہے



بنجر پہاڑ اپنی ویرانیوں میں کھو جانے کی دعوت دیتے ہیں

محمود شام

کوئٹہ کی صبح بہت خشک ہوتی ہے اور خنک بھی۔ صبح سویرے بھٹو صاحب کراچی کے لئے روانہ ہو گئے ہم بھی آج کوئٹہ سے باہر نکلنے اور بلوچستان دیکھنے کا پروگرام بنا رہے تھے۔ مرزا احامد علی بیگ، اپنی مصروفیات میں سے کچھ وقت نکال کر ہمارے ساتھ چلنے کا وعدہ کر رہے تھے۔ صبح وہ اپنی سینٹرل مین سمیت بلدیہ ہاؤس آ پہنچے ہیں، الطاف رانا اور فاروق معین۔ ان کے ساتھ ہو لئے۔ راستے میں پی آئی اے سے کل کے لئے اپنی سیٹیں بک کراتے ہم کوئٹہ سے باہر نکلے، کوئٹہ کی آبادی ختم ہوتے ہی پھر لق و دق صحرا، اور خشک پہاڑ اپنی ویرانیوں اور تنہائیوں میں کھو جانے کی دعوت دینے لگے۔ ایک انجانا سا احساس، شاید فنا کا احساس۔ پیدا ہو رہا تھا۔ درمیان میں بلوچستان یونیورسٹی بھی پڑی، بلوچستان کو ۲۴ برس میں پہلی بار یونیورسٹی ملی ہے، آہستہ آہستہ تکمیل کی راہیں طے کر رہی ہے۔ یونیورسٹی کی مختلف تعمیرات بالکل ایسے لگتی ہیں، جیسے صحرا میں خیمے تنے ہوں، سبزہ ہے نہ رونق ہے۔ نہ دوسری یونیورسٹیوں کی طرح آنچلوں کی بہار کبھی یہاں صحرا تھا۔ آج یہاں علم کے سرچشمے ہیں، کل یہاں رونقیں ہوں گی۔ یونیورسٹی سے معاً آگے چیک پوسٹ ہے۔ یہ سڑک کراچی تک جا رہی ہے۔ قلات تقریباً نوے میل دور ہے کراچی قریباً چھ سو میل۔ یہ سڑک ابھی ساری کی ساری پکی نہیں بن سکی، لیکن قلات تک بڑی اچھی ہے، کار فراٹے بھرتی چلتی ہے۔ دونوں طرف دور دور تک سبزے کا کوئی نشان نہیں، البتہ سوکھے، بنجر اور گونگے پہاڑ کھڑے ہیں۔ کسی صاحب نے بتایا یہ کوہ سرفراز کا سلسلہ کہلاتے ہیں۔ یہ کسی مردہ تہذیب کا ملبہ معلوم ہوتے ہیں، کھنڈر، خرابے۔ جہاں سے کسی احمد فراز کو فن کے موتی ملنے کی امید ہو سکتی ہے۔ ان پہاڑوں سے کچھ نہیں اُگتا۔ نہ ان پہاڑوں کے دامن میں کچھ ہے۔ ان صحراؤں کو پہاڑوں کی وادیاں ضرور کہا جا سکتا ہے۔ مگر یہ پربتوں کی شہزادیاں نہیں ہیں اور یہ کسی فلم کی ہیروئین سے نہیں پوچھتی ہیں کہ وہ کب دلہن بنے گی —؟ ان وادیوں سے دوشیزائیں نہیں گزرتیں، محنت کش اور بہادر بلوچی — اپنے اونٹوں کی نکیل تھامے گزرتے ہیں، انہیں رزق کی تلاش ہوتی ہے۔ ان کے اونٹوں پر خشک جھاڑیاں ہوتی ہیں، اونٹوں پر خاندان سوار ہوتا ہے۔ ساتھ ایک کتا چلتا ہے۔ جو ان کا محافظ کہلاتا ہے، یہ قافلہ ہی ان بلوچیوں کی کل کائنات ہے۔ ان کا کوئی گھر نہیں ہے۔ شہر میں جا کر ان جھاڑیوں کو فروخت کر دیں گے، اور اس کے بدلے کچھ دنوں کا راشن لے کر کسی اور جگہ رزق ڈھونڈنے چلے جائیں گے۔ ان وادیوں سے یہ قافلے گزرتے ہیں، یا ان وادیوں نے ان بلینیا پوش مزدوروں کو دیکھا ہے جو کدال لئے ان صحراؤں میں سے بل کھاتی سڑک تیار کرتے ہیں، یہ وادیاں بلوچیوں کو گھوڑوں پر جاتے دیکھتی تھیں، اور کبھی اونٹوں پر — اب یہ وادیاں سرداروں کو، جاگیرداروں کو، کاروں میں گذرتے دیکھتی ہیں۔ پہلے ان وادیوں سے ان لوگوں کا قریبی رشتہ ہوتا تھا اب تو وہ نظر ڈالے بغیر ہی ان سے گزر جاتے ہیں۔ لیکن غریب بلوچی کا اب بھی ان وادیوں اور اپنی زمینوں سے وہی رشتہ ہے، وہ اب بھی اونٹ پر گذرتا ہے تو ان وادیوں کو اپنی آنکھوں میں اتارتا جاتا ہے۔ اس کا رشتہ نہیں ٹوٹتا۔ ان وادیوں نے



(دائیں سے) مرزا حامد علی بیگ ، محمود شام ، کمشنر قلات اور فاروق معین

بڑے شہروں میں رہنے والو!
اپنے ان ہم وطنوں کی زندگی بھی دیکھو

ہی تو اس کو جنم دیا اور اس کو پالا۔ وہ اپنی ماں کو کیسے بھلا سکتا ہے۔

بل بین بھاگ رہی تھی، اور راستے میں محنت کش سڑک کو اور وسیع کر رہے تھے، کدال کی چوٹ صحرا کو سڑک میں تبدیل کر رہی تھی۔ ہمیں پہلے مستونگ جانا تھا۔ قلات ڈویژن کے کمشنر کے ساتھ ہماری چائے تھی۔ مستونگ میں اس علاقے کا ایک جشن بھی ہو رہا تھا۔ آج اس جشن کا آخری دن تھا۔ جشن جشن میں فرق ہوتا ہے۔ یہ جشن شہنشاہیت ایران تو نہیں تھا۔ یہ تو اس علاقہ کے غریبوں کا میلہ تھا۔ جہاں غریبوں نے گیت گائے، اپنی مصنوعات اور کھانے پینے کی چیزیں فروخت کیں، اپنے علاقے کی فلمیں دیکھیں اور بس۔

یہاں سب مکان کچے ہیں، مٹی کے انسان، مٹی کے مکان انسان نظر آجائے تو غنیمت ہے۔ ڈھاکے میں کرفیو کی گھڑیاں قریب آتیں تو جو ویرانی چھانے لگتی تھی، وہی یہاں دکھائی دیتی ہے۔ مگر یہاں تو ویرانی۔ زندگی کا ایک جزو بن گئی ہے۔ ہم بڑے شہروں کی رونقوں کے عادی، بلوچستان کے لوگ ویرانیوں کے عادی، — وہ ویرانیوں سے سمجھوتہ کر چکے تھے۔ ہم انہی ویرانوں سے ہوتے مستونگ کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ مستونگ میں اس وقت قلات کے کمشنر جناب دلشاد صاحب ٹھہرے ہوتے ہیں ان کے ساتھ ہمیں چائے پینا ہے۔ ریسٹ ہاؤس میں کمشنر صاحب نے ہمارا استقبال کیا۔ سادہ سے لباس میں سادہ سے آدمی۔ ہم ان کے دفتر میں آکر بیٹھ گئے۔ وہ اگرچہ پنجاب سے تعلق رکھتے ہیں، لیکن بلوچستان میں بڑے لمبے عرصے سے ہیں اور بلوچستان کے مسائل سے اچھی طرح واقف ہیں۔ پہلے تو وہ ہم سے کراچی کے بارے میں اس طرح پوچھتے رہے کہ ہم جیسے کسی دوسری دنیا سے آئے ہیں۔ کہنے لگے کہ ہم نے تو اپنے آپ کو بلوچستان کی خشک زندگی میں سمو لیا ہے آپ بڑے شہروں کے لوگ تو جانے ہمارے علاقے کے بارے میں کیا سوچتے ہوں گے۔ لیکن یہاں سرکاری نوکری کرنا یا یہاں زندگی گذارنا اپنی نوعیت کا واحد تجربہ ہے انہوں نے بتایا کہ بلوچستان کا سب سے بڑا مسئلہ ذرائع مواصلات کا ہے۔ سڑک کی سہولت بہت کم علاقوں میں حاصل ہے۔ زیادہ تر علاقوں میں اونٹ اور اس سے زیادہ علاقوں میں صرف پیدل چلنا۔ ذریعہ سفر بن سکتا ہے۔ وہ بتانے لگے کہ انتخابات کے دنوں میں بعض علاقوں سے نتائج تین روز بعد حاصل کئے جا سکے، ووٹروں کا پولنگ اسٹیشن تک پہنچنا تو بذات خود ایک مسئلہ تھا۔ نتائج کی سنیئے کہ پولنگ اسٹیشن جہاں ووٹ گنے جا رہے تھے، وہاں ساتھ ہی ایک شخص اونٹ پر تیار بیٹھا تھا۔ نتیجہ تیار ہوتے ہی اس کے حوالے کیا گیا۔ اور یہ اونٹ جس فاصلے تک چل سکتا تھا۔ اس کے بعد پھر ایک اونٹ سوار تیار کھڑا تھا۔ وہ اس اونٹ سوار سے کاغذات وصول کر کے اگلے اونٹ سوار تک پہنچاتا تھا۔ پھر اس کے بعد یہ نتیجہ ایک ایسے موڑ پر پہنچتا تھا۔ جہاں سے جیپ میسر تھی اس طرح چار پانچ مراحل طے کر کے نتیجہ ڈویژن کے صدر مقام تک پہنچتا تھا۔ اسی لئے بلوچستان کے نتائج موصول ہونے میں تاخیر ہوئی۔

کمشنر صاحب کہنے لگے کہ آپ بڑے شہروں کے رہنے والے صحافی کسی وقت بیس تیس روز کے لئے آئیں تو آپ کو بلوچستان کی حقیقی زندگی دکھائیں کہ یہاں آپ کے ہم وطن کتنی کٹھن زندگی گذارتے ہیں، انہیں کن کن مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے انہوں نے ایک دو علاقوں کے بارے میں بتایا کہ وہاں کے لوگ اکثر سندھ اور دوسرے علاقوں میں رزق کی تلاش میں چلے جاتے ہیں پینے کا پانی بھی یہاں بہت کم لوگوں کو میسر ہے۔ کنواں کھودنے پر بھی پانی جلد نہیں نکلتا۔ اس لئے روزگار بھی نہیں ہے۔ لوگوں کا اثاثہ صرف بھیڑ بکریاں ہیں۔ بیس پچیس روز کے لئے آیئے اور اپنے ان

قلات کا ہوائی اڈہ

جہاں ایوب خان نے

فوجیں اُتاری تھیں

ہم وطنوں کے درمیان زندگی کے کچھ لمحے گذاریئے، ہم آپ کو خاران کے کسی قافلے کے ساتھ کر دیں گے جو رزق کی تلاش میں کسی دوسرے علاقے جا رہا ہوگا. اس قافلے کے ساتھ دو تین دن سفر کیجیئے، آپ کو اندازہ ہوگا زندگی کیا ہے. کہیں رستے میں کام مل گیا محنت مزدوری کرلی. معاوضہ پالیا. پھر آگے چل کر اس سے راشن خرید لیا. پھر چل پڑے. یہاں صرف آج کی روٹی پاس ہوتی ہے کل کی فکر نہیں ہوتی.

نے اپنے فوجی دستوں کے لئے ہوائی اڈے کے طور پر استعمال کیا تھا. انہوں نے قلات پر چڑھائی کی اور خان آف قلات کو گرفتار کیا تھا. اقتدار کی جنگ بھی کیا ہوتی ہے ایوب خاں ہیں مگر اب صدر ایوب خان نہیں ہیں خان آف قلات ہیں مگر وہ اب قلات کے مطلق العنان فرمان روا نہیں ہیں. وقت وقت کی بات ہے یہ کھنڈر یہ ملبہ قلات کے پرانے قلعے کا ہے ابھی محکمۂ آثار قدیمہ کو فرصت نہیں ملی ہے کہ وہ یہاں کا رخ کرے



خان آف قلات دائیں سے، فاروق معین، محمود شام اور مرزا حامد علی بیگ

اور اس خرابے میں سے وفا کے موتی ڈھونڈے قلات کے قریب ہی وہ پرانا شہر بھی ہے جو ۱۹۳۵ء کے زلزلے میں زمین بوس ہو گیا تھا. اب صرف کھنڈرات باقی ہیں. قلات پر دوپہر طاری ہے. شہر خاموش ہے. کچی دیواروں میں گھرے ہوئے مکان کہیں کہیں ڈھول میں لپٹے درخت ہم خان آف قلات کے ریسٹ ہاؤس میں پہنچ گئے ہیں. اس ویران اور دھول میں لپٹے شہر میں سیب کے باغ کتنے لدے پھندے ہیں. پکے سیب نیچے آرہے ہیں، ریسٹ ہاؤس میں کھانے سے فارغ ہو کر ہم نے تھوڑی دیر آرام کیا اور پھر خان صاحب کے محل کی طرف چل نکلے. فرمانروائی نہیں رہی، لیکن اعزازات اور گارڈ وغیرہ سب کچھ میسر ہے. بہت اونچی دیواروں کے اندر ایک دنیا آباد ہے. مختلف سڑکوں سے ہوتے ہم خاں صاحب کے ڈرائنگ روم کی طرف

جا پہنچے. جو مغل شہنشاہوں کی زبان میں دیوانِ خاص کہلاتا تھا، ایک لمحے بعد خاں صاحب پہنچ گئے. خاصی عمر ہو چکی ہے دوسرے تمام پاکستانیوں کی طرح انہیں بھی موجودہ واقعات پر تشویش تھی وہ ہم سے پوچھنے لگے کہ کیا ہونے والا ہے؟ جو کچھ ہمیں معلوم تھا. بتا دیا. پھر ان سے ہم پوچھنے لگے کہ بھٹو صاحب سے آپ کی کیا بات ہوئی. ہم نے خاں صاحب کو بھٹو صاحب سے بات چیت کے سلسلے میں مطمئن پایا. وہ بھٹو کی قیادت کو خراج تحسین پیش کر رہے تھے اور کہا کہ میں ان سے مل کر بے حد مطمئن ہوں. میں نے ان کے بارے میں سنا تھا کہ وہ بے حد جذباتی ہیں. لیکن میں نے ان سے بات چیت کی تو ان کو بے حد مدبر، زیرک اور دیانتدار پایا وہ باتیں سچی کرتا ہے اگر اسے موقع ملا تو

دلشاد صاحب نہایت پیار بھرے لہجے میں یہ باتیں سنا رہے تھے، میں نے وعدہ کر لیا کہ جب بھی آپ بلائیں ہم چلنے کو تیار ہیں. وہ بتا رہے تھے کہ بلوچستان کی زمینیں اتنی وسیع ہیں، اور بنجر سپاٹ پانی کی بڑی دقت ہے، اس لئے آبادی کم ہے صنعتوں کا نام و نشان نہیں ہے. اب ادھر گوادر کے قریب ہی گیری کی صنعت قائم کی جا رہی ہے. امید ہے، بلوچستان کے بہت سے لوگوں کے لئے روزگار فراہم ہو جائے گا.

میں نے کہا کہ ایک سیاستدان نے کہا ہے کہ گوادر کے بارہ ہزار افراد کے لئے بارہ لاکھ روپے خرچ کر کے پانی کا انتظام کیا جا رہا ہے لیکن لاکھوں افراد کے لئے پانی پر ہزاروں روپے بھی خرچ نہیں کئے جا رہے.



بلوچستان کے بنجر پہاڑ۔ محنت کشوں کی تراشی ہوئی سڑک

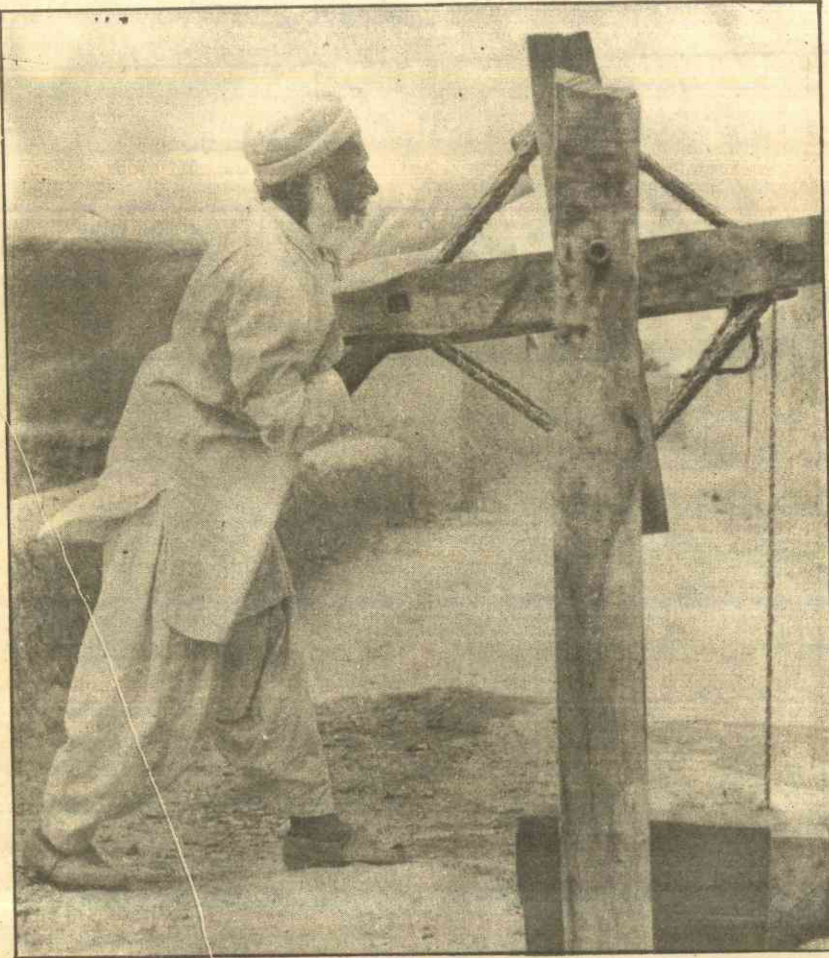
خانہ بدوش بلوچی

صرف آج کے رزق

کی فکر کرتا ہے

اس پر کمشنر صاحب کہنے لگے۔ اس علاقے میں پانی نزدیک سے دستیاب ہے، پھر یہاں صنعتی علاقہ بنایا جا رہا ہے یہاں اگر صنعتی ترقی ہوگی تو پورے بلوچستان میں اس کے اثرات پھیلیں گے، دوسرے علاقوں میں بھی آہستہ آہستہ پانی کی فراہمی کے انتظامات کئے جائیں گے فی الحال تو مواصلات کے ذرائع پر زیادہ توجہ دی جا رہی ہے تاکہ بعد میں ترقیاتی منصوبوں کی تکمیل میں آسانی ہو۔ اور مشینری کی نقل و حرکت بھی آسانی سے ہو سکے۔ اب کراچی سے کوئٹہ کے درمیان سڑک کافی حد تک بہترین حالت میں ہے۔ ابھی کچھ حصہ باقی ہے بلوچستان میں چند ایک قصبے ہیں جہاں ابھی شہری سہولتیں بھی نہیں ہیں، قلات ڈویژن کے صدر مقام خضدار میں سینما گھر بھی نہیں ہے۔ یوں لوگوں کو تفریح کا سامان بھی میسر نہیں ہے۔

اتنے میں چائے آ گئی، بسکٹ اور بہت کچھ چلے ہی' ہمیں دوپہر کا کھانا قلات میں۔ خان آف قلات کے ہاں تھا ۔منزل دور تھی۔ ۶۰ میل کے قریب۔ دھوپ تیز ہو رہی تھی۔ ویرانیاں منہ پھاڑ رہی تھیں، ہم نے کمشنر صاحب سے اجازت لی اور پھر بیگ صاحب کی ہل مین کراچی قلات روڈ پر اسی میل فی گھنٹہ کی رفتار سے بھاگنے لگی۔ پھر وہی ویرانیاں بنجر پہاڑ۔ وہی دور دریہ کو کدائیں اٹھاتے مزدور، اور کہیں کہیں اونٹوں پر سوار قافلے۔ ہم قلات کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ الطاف رانا بتا رہے ہیں کہ یہ چھوٹا سا میدان جہاں اس وقت خانہ بدوشوں کا قافلہ خیمہ زن ہے۔ اسے اگر پٹھان وہ یقیناً اس ملک کو آگے لے جائے گا۔ انہوں نے بھٹو صاحب کی اس بات کو بالکل صحیح قرار دیا کہ باہر پاکستان کا وقار بہت مجروح ہو رہا ہے۔ انہوں نے



پانی کی تلاش

یقین ظاہر کیا کہ صدر یحییٰ منتخب عوامی نمائندوں کو اقتدار منتقل کر دیں گے۔ کیونکہ وہ اس سلسلے میں مخلص ہیں۔ خان صاحب نے کہا کہ ہم بلوچ لوگ کسی کا ساتھ انتہائی سوچ سمجھ کر دیتے ہیں اور جب ساتھ دیتے ہیں تو پھر آخری دم تک اور اپنے تمام تر خلوص الاظہر پور طاقت کے ساتھ۔ خان صاحب سے پھر ہم نے قائداعظم کے بارے میں کچھ پوچھا تو ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے کیا بات ہے اس عظیم رہنما کی۔ قائد اس ریسٹ ہاؤس میں ٹھہرے تھے۔ جس میں آپ نے دوپہر کا کھانا کھایا۔ قائد مجھ سے بہت محبت کرتے تھے قائد کو بلوچوں کی بہت قدر تھی۔

خان صاحب نے کہا کہ یہ بلوچوں کی بہادری کے سبب ہی تھا کہ ہم نے ایک طرف برصغیر ہند اور دوسری طرف روس جیسی مملکتوں کے درمیان ۳۰۰ برس تک قلات پر حکمرانی کی اور ریاست، کی وحدت کو سلامت رکھا۔

آخر میں ہم خان صاحب سے اجازت لے کر اٹھے تو انہوں نے کہا کہ دعا کیجئے کہ ملک سلامت رہے تو سب کچھ ہے ہم جب قلات سے باہر نکلے تو شام کے سائے پھیل رہے تھے اور دس بارہ میل آگے نکلنے پر اندھیرے نے پورے راستے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ جیسے ستم کی طویل رات نے۔ پاکستان کے عوام کو اپنی لپیٹ میں لیا ہے پچاس ساٹھ میل نکل کر چند مدھم روشنیاں دکھائی دیں۔ امید کی کرنیں۔ ایسی روشنیاں دکھائی دیتی ہیں۔ ان روشنیوں کے بعد ہم تو اپنی منزل مقصود کوئٹہ، پہنچ گئے۔ لیکن امید کی روشنیاں جو پاکستان کی تاریخ کے سفر میں دکھائی دے رہی ہیں انہوں نے ہمیں اپنی منزل مقصود پر اب تک نہیں پہنچایا۔

اگلے روز ہم جہاز سے کراچی روانہ ہو گئے۔ یہ سفر فاروق معین کے لئے تو نہایت خوشگوار تھا کہ انہیں ایک اچھا ہم سفر مل گیا۔ ہم تو وہی محروم رہے ازلی - ابدی محروم

پشاور

پاکستان ٹوبیکو کمپنی — اُونچی دُکان، پھیکا پکوان

نمائندہ الفتح

۷ اکتوبر کے "الفتح" میں پاکستان ٹوبیکو کمپنی اور فیٹ اٹلی کے ملک دشمن خفیہ معاہدے اور پاکستانی معیشت کو نقصان پہنچانے کی سازش کا انکشاف کیا گیا تھا۔ اب اس کمپنی کی مزدور دشمنی کا حال سنیئے۔

پاکستان ٹوبیکو کمپنی ملک کا ممتاز سگریٹ ساز ادارہ ہے۔ ہر سال اپنی مصنوعات کے نرخوں میں اضافہ کر کے مسلسل اپنی دولت کو بڑھا رہا ہے۔ اس سال ایک کروڑ ۳۵ لاکھ روپے کا منافع کمایا۔ اتنا منافع کمانے کے باوجود یہ ادارہ اپنے مزدوروں کو بنیادی سہولتیں دینے سے انکاری ہے "اونچی دکان پھیکا پکوان" کے مصداق اس کے مزدوروں کے حالات کار ملک کی دوسری ٹوبیکو کمپنیوں سے بھی خراب ہیں حد تو یہ ہے مزدوروں کے لئے پینے کے پانی کا بھی انتظام نہیں ہے پاکستان ٹوبیکو کمپنی ورکرز یونین لیف ایریا کے مسلسل احتجاج اور شکایات کے بعد لیفادر بائینگ سنیٹر اور گوداموں میں پانی کے لئے مٹکے فراہم کئے گئے صرف اکوڑہ خٹک فیکٹری کے دفتر اور مشین روم میں واٹر کولر ہیں ڈیپوؤں بائینگ سنٹرز اور گوداموں میں کام کرنے والے مزدوروں نے تو واٹر کولر کی شکل تک نہیں دیکھی حالانکہ ڈھکی اور جہنبیر کے علاوہ ہر جگہ بجلی موجود ہے۔ اس کے برعکس انتظامیہ اور افسر حضرات کو پانی کی جگہ سوڈا اپ اور دیگر مشروبات دیئے جاتے ہیں اور جب یہ اعلیٰ افسر دورے پر جاتے ہیں تو اپنے ساتھ مشروبات اور برف موٹروں میں لے جاتے ہیں۔

اس کمپنی نے انتظامیہ کے اراکین کے لئے شاندار بنگلے تعمیر کئے ہیں۔ اور جن کو کمپنی کی جانب سے بنگلہ نہیں ملتا انہیں ۸۰۰ روپے ماہوار تک مکان کا الاؤنس دیا جاتا ہے۔ اس کے برخلاف مزدوروں اور نچلے درجہ کے ملازمین کو رہائشی سہولت دی گئی ہے اور نہ ہی کوئی الاؤنس دیا جاتا ہے۔

اس ادارے میں ترقی کا معیار صرف یہ ہے کہ ماتحت ملازم اپنے افسر کے لئے ذاتی طور پر کتنا کارآمد ہے۔ محنت، کام سے لگن ایمانداری سے انتظامیہ کو کوئی واسطہ نہیں، وہ خوشامد کو سب سے زیادہ وقعت دیتی ہے۔

ان حالات کے مدنظر اور مزدوروں کو حقوق دلوانے کے لئے پاکستان ٹوبیکو کمپنی ورکرز یونین لیف ایریا نے چند مطالبات پیش کئے۔ ان میں سے مندرجہ ذیل مطالبات پورا کرنے کے لئے انتظامیہ راضی ہو گئی۔

- تنخواہوں میں چار سے آٹھ روپے تک کا اضافہ۔
- آمدورفت کے الاؤنس میں چھ پیسے روزانہ کا اضافہ
- سائیکل الاؤنس میں دو روپے کا اضافہ
- اکوڑہ خٹک فیکٹری کے مشین روم سپروائزروں کے لئے وردی۔

مندرجہ بالا مطالبات سے بقول کمپنی ایک لاکھ اور ۲۰ ہزار روپے سالانہ کے خرچ کا اضافہ ہوتا تھا۔ اس لئے یہ شرط لگائی گئی کہ کمپنی آئندہ سال سیزنل مزدور بھرتی نہیں کرے گی۔ چونکہ مزدوروں کو روزگار فراہم کرنا یونین کا اولین فرض ہے اس لئے اس رسوا کن پیش کش کو مسترد کر دیا۔ انتظامیہ نے اس ناکامی کا بدلہ یوں لیا کہ تین ہزار مزدوروں کلرکوں اور چیکرز حضرات کو صرف دو ماہ ایک ماہ ملازمت رکھنے کے بعد برخاست کر دیا۔ حالانکہ یہی لوگ گذشتہ ۲۲ سال سے متواتر ہر سیزن میں چھ ماہ تک کام کرتے تھے۔ جب تنازعہ بڑھا تو محکمہ محنت نے مداخلت کی ۲ ستمبر ۱۹۷۱ء کو لیبر ڈائریکٹر نے فریقین کو بلایا۔ ۸ ستمبر ۱۹۷۱ء کو کمپنی کی جانب سے آر بی بارنڈوالے کے صاحبزادہ اور سلیم اختر نے یونین کے پیش کردہ مطالبات تسلیم کرنے کا وعدہ کیا۔ لیکن ۱۵ ستمبر کو تینوں حضرات اپنے وعدے سے مکر گئے۔ اور مقبوضہ اخبارات کے ذریعے پروپگنڈہ شروع کر دیا کہ ہم تو مطالبات ماننے کو تیار ہیں لیکن مزدور ہی مراعات لینے کو تیار نہیں ہوتے حال ہی میں انتظامیہ نے ایک پاکٹ یونین رجسٹر کرائی ہے اور اب اس بات کی کوشش کر رہی ہے کہ کسی نہ کسی طرح یہ پاکٹ یونین سودے کاری کی ایجنٹ بن جائے۔ تاکہ ٹھیکہ سسٹم شروع کیا جا سکے اکوڑہ خٹک فیکٹری میں اس کی ابتداء بھی ہو چکی ہے۔

ڈیرہ غازیخاں

اس میں ضرور منافقت اور ملک دُشمنی کا راز مضمر ہے

رئیس عدیم

آج کل ڈیرہ غازی خان کی سڑکوں پر چلنے والی کاروں کی پشت پر "کرش انڈیا" کے لیبل دکھائی دے رہے ہیں، انہیں دیکھ کر ۱۹۶۵ء کی جنگ یاد آنے لگتی، جب یہ کاروں والے اسی قسم کے لیبل لگا کر لاہور، سیالکوٹ، قصور اور دوسرے سرحدی شہروں سے بھاگ بھاگ کر ڈیرہ غازی خان جیسے محفوظ شہر چلے آئے تھے۔ عوام نے ۱۹۶۵ء کی جنگ میں اپنے دشمن کا بھرپور مقابلہ کیا۔ وہ بڑی دلیری سے لڑے

لیکن اسے کیا کہیئے کہ ان کاروں والوں نے جنگ ختم ہونے کے بعد انڈیا کی بھڑاس اپنے عوام پر نکالی ۔ انہیں خوب کچلا ہر طرح سے مزدوروں اور کسانوں طلبا اور دانشوروں پر حملہ آور ہوئے انہیں جیلوں میں ٹھونسا ۔ نوکر شاہی نے گولیاں برسائیں، زمینداروں نے بہشت نگر سجائے ۔ کارخانے داروں نے ٹنگھوپیر اور لانڈھی کو مزدوروں خون سے نہلایا ۔ راولپنڈی اور لاہور کی سڑکوں پر طلبا کی لاشیں تڑپیں ۔

کیا یہ عوام کو ان کی حب الوطنی کی سزا کے طور پر بھگتنا پڑا ؟

اس کا یہ مقصد نہیں کہ بھارت نے جارحیت سے کام لیا تو پاکستانی عوام دشمن کو دندان شکن جواب نہ دیں گے ۔ یقیناً وہ ڈٹ کر مقابلہ کریں گے ۔ لیکن اس جنگ سے قبل اندرونی دشمنوں کا صفایا ہو جائے تو زیادہ مناسب ہو گا ۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے قیام پاکستان کی مخالفت کی تھی ان کی اور ان کے سامراجی آقاؤں کی انتہائی کوشش رہی ہے کہ پاکستان ختم ہو جائے ۔ اس کے لئے انہوں نے مختلف ہتھکنڈے استعمال کئے ۔

"سبارت" جو کہ جماعت اسلامی کا ترجمان ہے اور جماعت اسلامی جو کہ قیام پاکستان کی بدترین دشمن ہے، جس نے پاکستان کے قیام کی نہ صرف مخالفت کی بلکہ قائد اعظم کی ذات پر ناروا حملے کئے ۔ اس نے اعلان کیا ہے کہ "کرش انڈیا" کے لیبل انہوں نے لگائے ہیں اس میں ضرور کوئی منافقت اور ملک دشمنی کا راز مضمر ہے ۔ اس سے یہ توقع رکھنا کہ وہ پاکستان کے وجود، سالمیت اور استحکام کے لئے کام کرے گی ۔ ملک دشمنوں کو تقویت پہنچانا ہے ۔ وہ اس ملک میں لمبی کاروں والوں کی ایجنٹ ہے اس کی چالوں سے خبردار رہنے کی ضرورت ہے

خضدار

بلوچستان کے غریب کسانوں کو ظلم سے نجات دلائی جائے

بلوچ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن (اینٹی سردار گروپ) خضدار کے مجلس عاملہ کا ایک اجلاس حبیب اللہ بلوچ کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں مندرجہ ذیل قراردادیں منظور کی گئیں!

- بلوچستان کے غریب کسانوں سے عموماً اور قلات ڈویژن کے غریب کسانوں سے خصوصاً بٹائی کے موقع پر دو دفعہ ٹیکس وصول کیا جاتا ہے ۔ ایک ٹیکس حکومت وصول کرتی ہے، دوسرا سردار، ہم حکومت سے مطالبہ کرتے ہیں کہ قلات ڈویژن کے غریب زمینداروں کو اس دوہرے ٹیکس سے نجات دلائی جائے ۔

- ہم گورنر بلوچستان سے مطالبہ کرتے ہیں کہ میڈیکل انسٹی ٹیوٹ کو میڈیکل کالج کا درجہ دیا جائے ۔ انجینئرنگ کالج قائم کیا جائے ۔ تربت انٹر کالج کو ڈگری کالج کا درجہ دیا جائے نیز کالج میں اساتذہ کی کمی پوری کی جائے اور فوری طور پر ہوسٹل تعمیر کیا جائے ۔

- پنجگور کے شہر چتکان کے الیکٹرک سپلائی اسکیم کب سے منظور ہو چکی ہے اور اس سلسلے میں کھمبے وغیرہ بھی پہنچائے گئے ہیں ۔ مگر ابھی تک اس اسکیم پر عملدر آمد نہیں ہوا ہم حکومت سے مطالبہ کرتے ہیں کہ اسکیم پر جلد از جلد عمل در آمد شروع کیا جائے ۔ نیز خاران میں الیکٹرک سپلائی اور واٹر سپلائی کا ناقص انتظام درست کیا جائے ۔

- گذشتہ سال کے سال سوئم اور سال اوّل کے جن طلبا کے ایک سال کے سکالر شپ ۶۵ روپے اور ۵۰ روپے ماہوار کے حساب سے منظور کئے گئے تھے ۔ لیکن سال سوئم کے طلباء کو کتابوں کے ۲۰۰ روپے نہیں ملے اور سال اوّل کے طلباء کو ۸۰ روپے کی بجائے ۵۰ روپے ماہوار کے حساب سے دیا گیا جبکہ سال سوئم کے باقی طلباء کو کتابوں کے ۲۰۰ روپے اور سال اوّل کے باقی طلباء کو ۵۰ روپے کی بجائے ۸۰ روپے ماہوار کے حساب سے دیا گیا ۔ ہم اس قرارداد کے ذریعے گورنر بلوچستان سے پُرزور مطالبہ کرتے ہیں کہ گذشتہ سال کے سال سوئم کے طلباء کی کتابوں کے ۲۰۰ روپے اور سال اوّل کے باقی ۳۰ روپے ماہوار کے حساب سے دیئے جائیں نیز سال رواں کے لئے فوری طور پر اسکالر شپ منظور کئے جائیں ۔ تاکہ طلبا ذہنی سکون کے ساتھ اپنی تعلیم جاری رکھ سکیں ۔

- ضلع خاران کی یونین کونسل ایری کلگ میں چھ پرائمری اسکولز ہیں مگر ایک بھی مڈل اسکول نہیں اور پورے ضلع میں مڈل اسکولوں کی تعداد آٹھ ہے ۔ لیکن ہائی اسکول صرف ایک ہے جس سے طلباء کی تعلیم میں رکاوٹ پیدا ہو رہی ہے ۔ اس لئے ہم حکومت سے مطالبہ کرتے ہیں کہ ایری کلگ اور بیدی کے پرائمری اسکولز کو مڈل اور مڈل کو ہائی اسکولز کا درجہ دیا جائے ۔

- پنجگور خدا بادان ہشکے کے گرلز پرائمری اسکول کو مڈل اور فاران و پنجگور اور چتکان کے گرلز مڈل اسکولز کو ہائی اسکولز کا درجہ دیا جائے ۔

- قلات ڈویژن کی یونین کونسلز کے سیکرٹریوں کو تقریباً ۲ سال سے تنخواہ نہیں مل رہی ہے ۔ اس وجہ سے وہ کافی پریشان ہیں اس لئے ان کی فوری طور پر حق رسی کی جائے ۔

- تحصیل ہشکے کی نئی ڈسپنسری کی بلڈنگ کے لئے حکومت نے جو رقم منظور کی تھی ۔ ٹھیکیدار نے نہ صرف پیسوں کو خرد برد کیا اور کام کو بھی ادھورا چھوڑ دیا ۔ نیز ضلع خاران کے موضع بیدی، موضع ایری کلگ اور پنجگور کی ڈسپنسریوں میں ڈاکٹر اور ادویات کا بندوبست کیا جائے ۔ اور تحصیل ہشکے کی نئی ڈسپنسری کی بلڈنگ جلد مکمل کرائی جائے

قلات ڈویژن میں ناقص ذرائع آمدورفت کی وجہ سے لوگوں کو پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے ۔ ہم حکومت سے مطالبہ کرتے ہیں کہ ناقص ذرائع آمدورفت کو درست کیا جائے نیز ہشکے سے جھاؤ تک عوام کی تکالیف کو مدنظر رکھتے ہوئے آمدورفت کا انتظام کیا جائے اور جھاؤ کے کسی ایک پرائمری اسکول کو مڈل کا درجہ دیا جائے ۔

لائلپور

سہگلوں کے مفادات کے محافظ صحافیوں کا گٹھ جوڑ

قیوم عابد

لائل پور سے اس وقت دس کے قریب روزنامے شائع ہو رہے ہیں، ان میں چار تو قیام پاکستان سے شائع ہو رہے ہیں، دو روزنامے شعلہ اور پیام قائد سرگودھا سے لائل پور میں سہگل سی آئی اے کے سربراہ مسٹر ٹنڈر سک کی بدولت آئے ہیں، دو روزناموں کو حال ہی میں ڈیکلریشن جاری ہوا ہے ۔ ان میں "ایام" مولوی غلام رسول جنڈیالوی ۔ اور "پنجاب نیوز" پرویز پاشا کا ہے ۔ یہ دونوں روزنامے لائلپور میں سہگل سیاسیات کے ترجمان کی حیثیت رکھتے ہیں ۔ جو شخص سہگل سیاسیات کا مخالف ہوتا ہے، ان دونوں روزناموں میں اس کی پگڑی اچھالی جاتی ہے ۔ گویا لائل پور

سہگلوں نے پریس کلب کا الیکشن جیت لیا

ہیں "ایام" اور "پنجاب نیوز" پگڑی اچھال صحافت کے علمبردار ہیں، جبکہ "شعلہ" اور "پیام قائد" میں ان افسران، بلدیہ ڈسٹرکٹ کونسل کے خلاف محاذ قائم کیا جاتا ہے جو کہ سہگلوں کے اشاروں پر ناچنے سے انکار کر دیتے ہیں۔ جب یہ اخبارات ایسے حضرات کے خلاف اپنی مہم کا آغاز عوامی نام پر کرتے ہیں تو افسران پریشانی کی حالت میں مارے مارے پھرتے ہوئے آخر تکیہ سہگلوں میں پہنچ جاتے ہیں۔ تو یہ اخبارات دوسرے روز ہی ان کے خلاف عوامی نام پر چلائی گئی مہم کو بند کر دیتے ہیں، لائل پور کا صرف ایک روزنامہ "غریب" سہگل سیاسیات کے خلاف ہے۔ اور وہ ان کی سیاست کو بے نقاب کرتا رہتا ہے جبکہ اس کے مقابلہ میں نو روزنامے ہیں، ان روزناموں میں جو تحریریں شائع ہوتی ہیں۔ وہ ایک ہی ذہن کی پیداوار ہوتی ہیں لائلپور کے لوگ انہیں "پی اے ٹو سہگل" کے نام سے جانتے ہیں یہ صاحب اپنی مخصوص ہیئت کی بنا پر ہر محفل میں فوری پہچان لئے جاتے ہیں۔ جس طرح مسٹر الطاف حسین قریشی انسانوں میں بیٹھا ہوا کسی دوسرے کرہ کی مخلوق ظاہر ہوتا ہے، اسی طرح یہ صاحب بھی موشے دایان کے ہم پلہ ہونے کی بنا پر یک بانو ہیں اور اپنی تخریبی صلاحیت جو کہ صرف تخریب کر سکتی ہے۔ سے پورا پورا فائدہ اٹھا کر مقامی اخبارات کے ایڈیٹر حضرات کو خرید لیتے ہیں، بدقسمتی سے کوہ نور ملز کے شعبہ اشتہارات کے انچارج بھی یہی صاحب ہیں، لہٰذا قومی اخبارات کے نمائندوں کو بھی بڑی آسانی سے اپنے قابو میں کر کے وہی کراتے ہیں جو کہ سہگل صاحبان چاہتے ہیں اس کے علاوہ کچہری بازار میں سہگلوں نے اپنا ایک تکیہ بھی قائم کر رکھا ہے، اس کے چیف مجاور بھی یہی پی اے صاحب ہیں، اس تکیہ میں ہر وہ کام ہوتا ہے جس کی انسانیت اجازت نہیں دیتی۔ لیکن سرمایہ دار کو ضمیر خریدنے کے لئے ہر ذوق کے افراد کو ان کے ذوق کے مطابق سامان فراہم کرنا پڑتا ہے، یوں سمجھ لیجئے کہ سہگل سی آئی اے کے سربراہ مسٹر ٹنڈر سک لائل پور کی صحافت، سیاست اور ادب پر چھائے ہوئے ہیں۔ یہ چند سطور اس لئے تحریر کرنی پڑی کہ "الفتح" کے قارئین لائل پور کی صحافتی زندگی سے قدرے متعارف ہو جائیں۔ اب میں اصل موضوع کی طرف آتا ہوں۔

گذشتہ ماہ لائل پور میں پریس کلب کے سالانہ انتخابات ہوئے تو عوام دوست صحافیوں نے لائل پور کی صحافت کو سہگلوں اور سہگلسٹ صحافیوں سے نجات دلانے کے لئے اپنے امیدواروں کا اعلان کیا۔ اس اعلان کو تکیہ سہگلوں کے مجاوروں نے اعلان بغاوت تصور کیا اور اس بغاوت کو کچلنے کے لئے سہگل سی آئی اے کے سربراہ مسٹر ٹنڈر سک کی قیادت میں ایک کمیٹی تشکیل ہوئی اور اس کمیٹی نے طے کیا سہگلسٹ صحافی حضرات میں ایسے افراد بھی موجود ہیں جو کہ اپنے اپنے مفادات کے لئے ایک دوسرے سے تعلقات منقطع کئے ہوتے ہیں۔ اب جبکہ مساوات کے ریاض رضا اور درویش صحافی اختر سدیدی زاد لطفہ نے سیکرٹری شپ اور صدارت کا انتخاب لڑانے کا اعلان کر دیا ہے۔ اگر یہ لوگ پریس کلب پر قابض ہو گئے تو لائل پور کی صحافت میں سرخ انقلاب آجائے گا۔ جو کہ ہمارے لئے وبال جان ہو گا۔ لہٰذا اس کمیٹی نے حافظ اکرام اختر نمائندہ مشرق کو سیکرٹری شپ اور سردار احمد اختر کو صدارت کے لئے اپنا امیدوار نامزد کر دیا۔ حافظ اکرام اختر اور پنجاب نیوز کے پرویز پاشا کی آپس میں سخت مخالفت تھی۔ ایک مقامی ٹرانسپورٹر سردار محمد سالک کی معرفت صلح کرادی اور پنجاب نیوز جو کہ قبل ازیں اپنی محفل میں حافظ اکرام اختر کے خلاف محاذ کھولنے کا اعلان کر چکا تھا۔ اس نے دوسرے دن عوام دوست صحافیوں کے خلاف ایک ڈائری لکھی اور الٹا چور کوتوال کو ——— کے مصداق عوام دوست صحافیوں پر الزام عائد کیا کہ یہ سرمایہ داروں کے ایجنٹ ہیں اور کارکن صحافیوں کے حقوق پر ڈاکہ زنی کرنا چاہتے ہیں۔ جبکہ عوام دوست صحافی انتخابات کو صرف صحافتی حدود میں ہی رکھ کر اپنی سرگرمیوں میں مصروف تھے۔ مفاد پرست حضرات نے اس انتخاب میں یونائیٹڈ بنک کے وائس چیئرمین حسن امام کو بھی استعمال کرنا شروع کر دیا اور حسن امام نے حافظ اکرام اختر کی کامیابی کی صورت میں مقامی اخبارات کو اشتہارات اور پریس کلب کو دس ہزار روپے کے عطیہ دینے کا فیصلہ کیا۔ جس پر حافظ اکرام کے ساتھیوں نے بڑی خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ پریس کلب کی جو گرانٹ قومی اخبارات کے چند نمائندوں کے باہر ہونے کی بنا پر بند ہو چکی ہے، میاں رفیق سہگل نے وعدہ کیا ہے کہ وہ سترہ ہزار روپیہ پریس کلب کو ادا کریں گے مفاد پرست اور عوام دشمن صحافیوں کے پشت پناہ سرمایہ داروں اور ان کے گماشتوں کی بوکھلاہٹ سے آپ نے اندازہ کر لیا ہو گا کہ پاکستان میں سرمایہ دار زندگی کے کسی شعبہ میں بھی عوام دوست اور حق پرست افراد کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں، لائل پور پریس کلب کے انتخاب میں جماعت اسلامی نے بھی اپنا مخصوص کردار ادا کیا۔ اور کوہستان کے نمائندے مسٹر ریاض احمد پرویز نے ازلی منافقت کا ثبوت دیتے ہوئے حلف اٹھا کر ریاض رضا اور اختر سدیدی کو ووٹ دینے کا اعلان کیا لیکن جب ووٹ ڈالنے کا وقت آیا تو ان کی "صالحیت" بیدار ہو کر رقص ابلیس میں ہاتن مصروف ہو گئی۔ ایک دلچسپ اور حیرت انگیز امر یہ ہے کہ انتخاب سے ایک رات قبل جبکہ پریس کلب کے ممبران دوسرے روز سرمایہ دار صحافت کا جنازہ نکالنے والے تھے، لائل پور کے مقامی اخبارات کے مالکان نے اپنے کارکن صحافیوں کو زبانی نوٹس جاری کر دیئے کہ اگر تم نے حافظ اکرام اختر کو ووٹ نہ دیا تو اپنی ملازمت کا کہیں انتظام کر لو جبکہ مسٹر حسن امام نے صحافی حضرات کے یونائیٹڈ بنک میں ملازم افراد کو مختلف بہانوں سے تنگ کر کے اکرام اختر کے حق میں فضا کو ساز گار بنایا اور جن صحافیوں کے ضمیر خرید لئے گئے۔ ان کو ان کے ذوق کے مطابق کباب و شراب کے علاوہ بھی سامان فراہم کیا گیا اور وہ لوگ تمام رات اپنے اپنے ذوق کی تسکین کرتے رہے اس کے باوجود سہگلسٹ صحافی اس قدر خوف زدہ تھے کہ انہوں نے ایک بہت بڑے سرمایہ دار کے گماشتے کے ذریعہ اختر سدیدی کو دس ہزار روپیہ کی پیش کش کی مگر اس درویش صحافی نے دولت کو پاؤں کی ٹھوکر سے اڑاتے ہوئے شکست کھانا تسلیم کر لیا لیکن اپنا ضمیر فروخت نہ کیا، اس طرح لائل پور میں عوام دوست صحافی سرمایہ دار سیاست و صحافت، کی سازش سے وقتی طور پر ناکام ہو گئے۔ لیکن تاریخ اس بات کی گواہ رہے گی۔ کہ بوریا نشین جب بھی ایوانوں سے ٹکر لیتے ہیں تو ایوان میں زلزلہ آجاتا ہے۔



صادقین

رباعیات کی

منزل پر

چلتی پھرتی زندہ تصویریں دیکھنے والے زیادہ تھے

نعیم آروی

۱۴-اکتوبر کو پاکستان آرٹس کونسل کی عمارت میں ممتاز مصور صادقین کی مصور رباعیات اور بیاض کے دوسرے ایڈیشن کی افتتاحی تقریب تھی۔ وقت ساڑھے پانچ بجے کا تھا۔ سیڑھیوں کے نیچے سحر انصاری سفید شیروانی میں ملبوس ایک صاحب سے ادب کے کسی ادق مسئلے پر الجھے ہوئے تھے۔ حسب معمول ان کے بغل میں انگریزی کتابوں کا ایک ہجوم سمٹا ہوا تھا۔ ابھی رسم افتتاح میں دیر تھی ایسے موقعوں پر قصداً شرکت کرنے والے چہرے ابھی لاپتہ تھے۔

ایک صاحب نے بتایا۔ اس تقریب کے دولہا ابھی پیلیس ہوٹل میں ہوں گے۔ جانے پہچانے چہرے وہیں ہوں گے۔

گھڑی کی سوئی پانچ سے آگے بڑھی تو اس تقریب میں شرکت کرنے والوں کی آمدورفت شروع ہو گئی۔ ایک خاتون آئیں۔ بیل باٹم سیاہ چشمے نے ان کی خوبصورت آنکھوں کو ڈھک رکھا تھا۔ پتا لگانا مشکل تھا کہ وہ کس طرف دیکھ رہی ہیں سحر انصاری اور وہ صاحب ابھی تک گھتم گتھا تھے سحر انصاری وقت سے پہلے پہلے مسئلے کو نمٹانے کے لئے بے چین تھے، جب کہ دوسرے صاحب اس کے لئے تیار نظر نہیں آتے تھے۔ چاکلیٹی رنگ کی ایک کار رکی، سید سبط حسن گاڑی سے اتر کر کونسل کے کتاب گھر کے اندر چلے گئے شیشے پر ایک خوبصورت اشتہار چسپاں تھا۔ سورہ رحمٰن کا دوسرا خوبصورت ایڈیشن چھپ کر تیار ہو چکا ہے۔ اب گھڑی ساڑھے پانچ بجا رہی تھی۔ لوگ بڑی تعداد میں پہنچ چکے تھے۔

ایک صاحب نے کہا "صادقین خاصے مقبول ہیں، کافی لوگ پہنچ گئے"۔

"مگر صادقین صاحب ہیں کہاں"۔

"وہاں سے چل چکے ہیں۔ بس پہنچنے والے ہیں کسی نے اطلاع دی۔

ابھی باتیں ہو رہی تھیں کہ ایک سفید رنگ کی گاڑی آرٹس کونسل کی عمارت میں داخل ہوئی۔ اور اس میں سے صادقین، عرفان حسین کے ساتھ نیچے اترے

"یہ گاڑی کس کی ہے؟"

"اتنا جانتا ہوں کہ صادقین کی نہیں ہے۔

"تو پھر یقیناً آرٹس کونسل کے سیکرٹری عرفان حسین کی ہوگی"۔

چند لمحوں کے بعد اس تقریب کے دولہا یعنی مصور صادقین کی قیادت میں براتیوں کا ہجوم پہلی منزل کی طرف چلا تو میں نے مڑ کر دیکھا نیچے سید سبط حسن والہانہ انداز سے ذوالفقار علی بخاری سے گلے مل رہے تھے۔ ہال کی دیواروں پر صادقین کی مصور رباعیات، لگی ہوئی تھی۔ انہوں نے شعر بھی کہے تھے لکھا بھی خود ہی تھا اور ان کے اسکیچ بھی بنائے تھے۔ ہال کے فرش



مولانا ماہر القادری
بیگم سروری عرفان اللہ
اور اداکارہ ریشماں میں
قدرِ مشترک - صادقین

پر رنگ و بو کی ایک جیتی جاگتی دُنیا بہہ رہی تھی ہوسے ہوسے مدھم مدھم روشنی میں ڈوبی رنگ و روغن لپ اسٹک، غازوں بیل باٹم، ایوننگ ان پیریس کی ایک ایسی دنیا جس کا عام زندگی سے دور کا واسطہ نہیں۔

صادقین دروازے کے قریب ہی کھڑے تھے ایک عدد اسکیچ اور اپنے دستخط کے ساتھ رباعیات صادقین، اور بیاض صادقین، فروخت کر رہے تھے یہ ایک غیر ملکی نے ان سے پوچھا۔ کیا آپ ان کے بارے میں کچھ بتائیں گے" ؟

صادقین نے کہا "رباعیات اور بیاض کا پینٹر رائٹر اور کیلی گرافسٹ ہوں"۔

"ان کا مرکزی خیال کیا ہے۔؟"

"رباعیات پر مبنی تصاویر جدید موضوعات پر ہیں۔ کچھ میں صرف لائنوں کی مدد سے مفہوم اور مطلب بیان کیا گیا ہے"۔ صادقین نے جواب دیا۔

انہوں نے رباعیات اور بیاض خرید لی۔

ہال کے دروازے کے پاس ہی مدیر افکار صہبا لکھنوی بیاض کھولے صادقین پر داد کے ڈونگرے برسا رہے تھے۔ کچھ لوگ، بلکہ بیشتر شائقین چلتی پھرتی زندہ تصویروں کو پرکھنے اور تعریف کرنے میں زیادہ سرگرمی دکھا رہے تھے۔ ایک طرف مشرقی پاکستان کی ممتاز فلم اسٹار ریشماں ایک صاحب کو ایک بڑی سی پینٹنگ سمجھا رہی تھیں دو نوجوان صاحبزادے جن کی زلفیں دراز تھیں اور غرارے پہن رکھے تھے، ان کے عقب میں کھڑے ہوئے "گاڈ کے بنائے ہوئے شاہکار کی داد دے رہے تھے۔ بخاری صاحب ایک بے حد اسمارٹ نوجوان سے مسکرا مسکرا کر باتیں کر رہے تھے۔ صادقین کے گرد سولوٹن اور بیل باٹموں کا ہجوم لگا ہوا تھا۔ اتنے میں کسی صاحب نے دھیرے سے کہا "جماعت اسلامی بھی آگئی"۔

میں نے مڑ کر دیکھا تو مولانا ماہر القادری نظر آئے۔ ان کے ساتھ دو آدمی اور تھے جماعت اسلامی کے ترجمان روزنامہ جسارت نے انہیں اپنے صفحات پر جگہ دے کر ان سے زبردست انتقام لیا ہے۔ اچھے خاصے مصور کے بارے میں کہا جانے لگا۔ اگر جماعت اسلامی نے صادقین کو نوازنے کا سلسلہ جاری رکھا تو لوگ ان کی نمائش میں جائے نماز اور لوٹا ساتھ لے کر آیا کریں گے۔

مولانا ماہر القادری ایک جگہ کھڑے ہوئے رباعی پڑھ رہے تھے۔

آیا ہوں نمائش میں یہیں دیکھوں گا
جتنے یہاں آئے ہیں حسین دیکھوں گا
تصویریں جہاں گھوم رہی ہوں زندہ
کاغذ کی میں تصویر نہیں دیکھوں گا'

ایک سرو قد خاتون ہال میں داخل ہوئیں تو ساری نگاہیں ایک دم سے اٹھ گئیں بڑے ناز و انداز سے چلتی ہوئی ایک جگہ ٹھہر گئیں۔ اس جگہ سے ہٹیں تو میں رباعی پڑھنے کے شوق میں اس جگہ پہنچ گیا۔

کس ناز سے نازوں کی پلی آئی ہے۔
بن کر وہ یہاں نقش چلی آئی ہے
شائد کوئی تصویر ہے زندہ ہو کر
غاروں کے اجنتا سے چلی آئی ہے

نمائش میں بیگم سروری عرفان اللہ بھی نظر آئیں کسی کالم نویس کا شوخ لڑکا اندر گھس آیا تھا اس نے قدرے بلند آواز میں رباعی کا شعر پڑھ ڈالا۔

اے شوخ محبّت ہے ضرورت کے لئے
تیری ہے ضرورت میری خلوت کے لیئے

شہریار جلیس دیکھنے میں اریٹریا کا مجاہد لگتا ہے، مگر ہالی وڈ کی ایکشن پیکڈ فلموں کا زبردست مداح ہے کسی غیر ملکی دوست سے گفتگو کر رہا تھا۔

میں قریب پہنچا تو وہ صاحب کہہ رہے تھے،

Are you unmarried?

yes.

Then go. meet her and enjoy yourself.

وہ خلوص سے مشورہ دے رہے تھے۔

اس جگہ فیض احمد فیض بھی تھے۔ فیض صاحب دوسرے فن کاروں کی حوصلہ افزائی میں ہمیشہ

باقی صفحہ ۴۲ پر ملاحظہ فرمائیں



قارئین کہتے ہیں

رکھا ہوا ہے میرا رسم الخط سندھی ہے اگر کوئی لفظ یا جملہ غلط ہوگیا ہو۔ تو براہ کرم اسے صحیح پڑھ لیں۔
محمد سونار ارباب۔ ٹنڈو اللہ یار

بچوں کا صفحہ شروع کیا جائے ورنہ ...

بچوں کی طرف سے مظاہرے کی دھمکی

ہم آپ کا ہفت روزہ الفتح ہر ہفتے بڑے شوق سے خریدتے ہیں لیکن اس میں کوئی ایسا صفحہ یا مضمون نہیں ہوتا جو ہم جیسے لاکھوں بچوں کے پڑھنے کے لئے ہو اور جس میں ہم دلچسپی لے سکیں ہم نے اپنے بڑوں سے الفتح کی بہت تعریف سنی ہے لیکن ہمیں اس کا کیا فائدہ کیوں کہ اس میں ہمارے لئے کچھ نہیں ہوتا آپ سے ہمارا مطالبہ ہے کہ آپ اس میں فوراً بچوں کا صفحہ شروع کریں ورنہ ہم اپنے بڑوں کو بھی مجبور کریں گے کہ وہ الفتح خریدنا بند کر دیں اور ہم بچے مل جل کر آپ کے دفتر کے سامنے مظاہرہ کریں گے۔

فرخندہ محمود
قاسم محمود اور سلیم محمود
مظفر حسین اکبر حسین جاوید حسین
احسن حسین، شاہدہ نفیس۔ خالدہ
رانی، صفیہ۔ لوئیس کراچی)

اخبار نویس اور مزدور کسانوں کے مسائل

سب سے پہلے میں آپ کو مبارکباد دوں کہ آپ نے صحیح معنوں میں یہاں کے مظلوم عوام کی ترجمانی کے لئے رسالہ نکالا میں الفتح کا پرانا قاری ہوں۔ اور بلا ناغہ پڑھتا ہوں ہمارے شہر میں چند صحافی بھی موجود ہیں مگر وہ آپ جیسے نہیں ہیں وہ ہماری باتیں نہیں لکھتے ہمارے شہر میں بے پناہ مسائل ہیں۔ یہاں پانچ کاٹن فیکٹریاں ہیں ایک شوگر مل ہے ان میں کام کرنے والے مزدوروں کے مسائل بھی توجہ کے مستحق ہیں۔ بارہا ان اخباری نمائندوں سے کہا گیا مگر ان کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی۔ میں نے براہ راست اخباروں کو لکھا، مگر وہی ڈھاک کے تین پات، محنت کشوں کے مسائل اخبارات میں جگہ نہ پا سکیں پیپلز پارٹی کے اخبار ہلال پاکستان نے تھوڑی سی ہمدردی دکھائی کافی غور کرنے کے بعد آپ سے رابطہ پیدا کرنے کا خیال آیا۔ کیونکہ مجھے حقیقت میں صرف آپ کا رسالہ صحافتی اصولوں پر چلتا ہوا نظر آیا۔ میں آپ کو یہاں کے مسائل سے آگاہ کرتا رہوں گا۔ اس کا کوئی معاوضہ نہ ہوگا۔ ویسے میں طالب علم ہوں اور مزدور بھی شام کو ایک نائٹ کالج میں پڑھتا ہوں اور صبح مزدوری کرتا ہوں۔ مجھے سرمایہ داروں سے نفرت ہے شدید نفرت اپنے آپ کو مظلوم اس لئے نہیں کہتا کہ دراصل مظلومیت کے شکار یہاں کے مزدور اور کسان ہیں۔

سلام ہے۔ ان کسانوں اور مزدوروں کو جنہوں نے اپنے خون سے اس ملک کا وجود قائم

ٹیلی ویژن اور چربہ سازی

عام طور پر یہی سمجھا جاتا تھا کہ چربہ سازی کی لعنت صرف فلمی دنیا تک ہی محدود ہے۔ لیکن اب نیم سرکاری اور سرکاری ادارے یعنی ٹیلی ویژن اور ریڈیو بھی اس جرم کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ فلمی دنیا کے متعلق یہ کہہ کر کہ وہاں صرف ان پڑھ یا معمولی پڑھے لکھے لوگ ہوتے ہیں ہم اپنے آپ کو مطمئن کر سکتے ہیں، یا یہ سوچ کر کہ فلمی ناخدا دولت کی ہوس میں ملکی اور قومی اور سب سے بڑھ کر ذاتی وقار اور عزت نفس کا خون کر رہے ہیں ہم خاموشی اختیار کر لیتے ہیں۔ لیکن ٹی وی اور ریڈیو جیسے قومی اداروں میں جب چربہ سازی کا بھوت ناچتا ہوا نظر آتا ہے تو بے اختیار دعا نکلتی ہے کہ "خدا اسی ملک کی حفاظت کرے"۔

ابھی چند دن پہلے علی احمد صاحب کے نام سے ایک ڈرامہ پیش کیا گیا جس کا نام تھا آپریشن حلوہ پوڑی، ناظرین کے ذہن میں کراچی ٹیلی ویژن پر پیش کی گئی ایک فلم دی لانگ دی شارٹ اینڈ دی ٹال کی یاد تازہ ہوگئی۔ اگر آپریشن حلوہ پوڑی اور اس فلم کا موازنہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ آپریشن حلوہ پوڑی ہو بہو ایک چربہ ہے۔ صرف امریکن اور جاپانی کرداروں کو ہندو بنانے پر اکتفاد کیا گیا۔

اس کی دو وجوہ ہو سکتی ہیں پہلی یہ کہ ٹی وی کے ناخدا اپنے مخصوص لکھنے والے کا معاوضہ نصف نہیں کرنا چاہتے تھے (تلخیص یا ترجمے میں معاوضہ نصف ملتا ہے) یا وہ اس قدر لاعلم اور غیر ذمہ دار ہیں کہ انہیں اسی چوری کی خبر ہی نہ ہوئی۔ بہر حال،

دونوں صورتوں میں کراچی ٹیلی وژن مجرم ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ T V L I پر کسی پڑھے لکھے، دیانتدار شخص کو بھی رکھ لیا جائے۔

ریڈیو اس سلسلے میں ٹی وی سے بھی دو ہاتھ آگے ہے سلیم احمد، ریاض فرشوری صاحبان جو کراچی ریڈیو کے "مشہور لکھنے والے" ہیں اپنے اکثر ڈراموں کے مرکزی خیال غیر ملکی تخلیقات سے لیتے ہیں اور اکثر اوقات ان کی تخلیقات ایک بھونڈا ترجمہ اور اچھا چربہ ہوتی ہیں۔

بیپلیٹھ کوک کا مشہور ایک ایکٹ کا ڈرامہ "ان کانفی ڈیس" بڑے فخر سے سلیم احمد صاحب کے نام سے نشر کر دیا گیا۔

"بلی لائر" ایک مشہور کامیڈی لفظ بہ لفظ ایک مشہور کامیڈی لفظ بہ لفظ ترجمہ کر کے شب تمثیل میں پیش کیا گیا۔ اور اس دفعہ اس پہ چربوں کے ماہر ریاض فرشوری صاحب کا نام تھا۔ اردو میں اس کا نام "برخوردار" رکھا گیا۔

اس میں شک نہیں کہ ریڈیو، اور ٹیلی وژن کے کارپردازگان کے لئے ضروری ہے کہ وہ بعض مجبوریوں کی وجہ سے کچھ لوگوں کو ہمیشہ نوازتے رہیں لیکن ان نام نہاد لکھنے والوں کو کیا ہو گیا ہے اگر ان کے ذہن اتنے بنجر ہیں کہ وہ کسی تخلیقی کام کی اہلیت نہیں رکھتے تو پھر خدارا اصل لکھنے والوں کا نام تو بتا دیا کریں

شمشاد احمد

بقیہ: —— کراچی کی ڈائری

پیش پیش رہتے ہیں وہ فن کار ہیں اور فن کاروں کے جذبات سے بخوبی آگاہ ہیں انہیں دیکھ کر لوگوں نے انہیں گھیر لیا اور ان کا آٹو گراف لینا شروع کر دیا۔ وہ اپنے شوہروں کی طرح مسکراتے ہوئے سادقین کی طرف بڑھ گئے

جی ہاں۔ آج کے دولہا تو سادقین ہی تھے

بقیہ: ظاہری خبریں اندرونی کہانیاں

کہہ چکے ہیں کہ بائیں بازو والے نہ پاکستانی ہیں، نہ مسلمان جب وہ بائیں بازو والوں کو نہ پاکستانی سمجھتے ہیں نہ مسلمان ظاہر ہے دشمن سمجھتے ہیں، اس لئے وہ انہیں ہلاک کرنا بھی ضروری سمجھتے ہیں۔ جب وہ کہتے ہیں کہ ان کے رضاکاروں نے وطن دشمن ایجنٹوں کا ہلاک کر دیا ہے تو ظاہر ہے وہ یہی اعتراف کرتے ہیں۔

پروفیسر غلام اعظم کا پیپلز پارٹی کو یہ مشورہ کہ وہ مشرقی پاکستان سے دور رہیں، اس خوف کا احساس ہے کہ مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان کے بائیں بازو والوں کے پارلیمانی سطح پر اتحاد سے جماعت اسلامی بے نقاب ہو کر نہ رہ جائے۔ ہمیں معلوم ہے کہ دائیں بازو کی جماعتوں کے اس وقت منصوبے یہی ہیں کہ کسی طرح مشرقی پاکستان کے ضمنی انتخابات میں وہ بلا مقابلہ منتخب ہو جائیں اس اکثریت کے بل پر وہ مرکزی حکومت میں آ جائیں یہ مصنوعی اکثریت صرف اس لئے قائم کی جا رہی ہے کہ عوام محروم رہیں عوام کے خلاف یہ گٹھ جوڑ پہلے بھی قائم کئے گئے اب بھی قائم کئے جا رہے ہیں دائیں بازو کے لیڈروں کا یہ خیال کہ مشرقی پاکستان کی کابینہ کے وزرا بہر حال وزرا رہیں گے۔ انہیں صرف منتخب ہونے کا تکلف کرنا ہے، جیسے ایوب خان کے دور میں وزیر پہلے بنتا تھا۔ اسے منتخب بعد میں کر دیا جاتا تھا۔ دائیں بازو کی جماعتوں کا خیال ظاہر ہے انتظامیہ کی یقین دہانی کے بغیر نہیں ہے وہ مغربی پاکستان میں بھی اور مرکز میں بھی اس قسم کی حکومتیں قائم کرنا چاہتے ہیں تاکہ اقتدار پھر انہی سیاہ طاقتوں کے پاس رہے، جن کے پاس پہلے رہا ہے امریکہ اور دوسری مغربی طاقتوں کی بریفنگ بھی یہی ہے۔ پورے ملک کے کاروبار کو امن کمیٹیوں کے ذریعے چلانے کا یہ منصوبے نہایت خطرناک ہے اس لئے نتائج انتشار کی صورت میں ہی رونما ہوں گے۔

●●●

پیکنگ سے شاؤشان تک: صفحہ ۲۴ سے آگے

وہ اصرار کے ساتھ ہمیں سگریٹ پینے کی ترغیب دینے لگے انہوں نے بتایا کہ ابھی ہمیں اپنی جدوجہد جاری رکھنی ہے ہم چیئرمین ماؤ کی قیادت میں انقلاب کو پایۂ تکمیل تک پہنچا کر رہیں گے ابھی ہمیں اپنے بہت سارے مسائل حل کرنے ہیں۔ اب بھی بہت سے کشتی بان کشتیوں پر رہتے ہیں، ابھی بلڈنگوں کی کمی ہے۔ پھر بعض لوگ ایسے بھی ہیں جن کے پاس خشکی پر رہنے کا کوئی تصور نہیں ہے اور اس میں ان بے چاروں کا کوئی قصور نہیں ہے وہ برسوں سے پانی میں رہتے آئے ہیں اور اس کے عادی ہو گئے ہیں، خاص طور پر مضافات کے کشتی بانوں کو خشکی پر رہنے کی ترغیب دی جا رہی ہے وہ سمجھتے ہیں کہ کشتی میں رہنے سے بہت سے مسائل کا انہیں سامنا کرنا پڑے گا، روزانہ خشکی تک آنے جانے کا بکھیڑا کون برداشت کرے گا۔ شاید چین ہی ایسا ملک ہے جہاں اتنی انکساری اور صاف گوئی کے ساتھ مسئلے کے مثبت اور منفی پہلو ایک ساتھ پیش کر دیئے جاتے ہیں۔ کبھی اپنی کامیابیوں کو بڑھا چڑھا کر پیش نہیں کیا جاتا۔ واضح الفاظ میں یہ کہا جاتا ہے کہ چین ابھی اپنی ترقی کی منزل میں ہے، وجہ یہ ہے کہ صرف اور صرف انہیں اپنے اُوپر پورا اعتماد ہے۔

جب ہم انقلابی کمیٹی کے دفتر سے باہر نکلے تو باہر بچوں اور بوڑھوں کا ایک بڑا ہجوم ہمارا منتظر تھا۔ انہوں نے اور زور سے تالیاں بجائیں۔ اور ہم نے ایک بار پھر کشتی بانوں کے روشن فلیٹوں کی طرف دیکھا۔ بالکونیوں پر رنگ برنگے پھولوں کے گملے سجے ہوئے تھے، رسیوں پر کپڑے جھول رہے تھے۔ کھڑکیوں سے بہت سے مسکراتے چہرے ہماری طرف جھانک رہے تھے۔ انقلابی کمیٹی کے اراکین ہاتھ ہلا ہلا کر ہمیں رخصت کر رہے تھے کسی فلیٹ میں سے ریڈیو پر مزدوروں کا بین الاقوامی ترانہ انٹرنیشنل بج رہا تھا۔

چھی لائے چی ہان چو بھوتی نولی
چھی لائے چھوان شڑ چے شو کھوتی ژن
مان چھانگ تی ژڑ شوئے ای چینگ فو تھنگ،
یاوے لاچنگ لی اڑ تو چن
چیو شڑ چے تا کا لو خواڑ لیو شوئے، نولی من، چھی لائے، چھی لائے۔
پیاؤ، شوو من ای او شولیو، وومن یاؤ چو تھیان شیا تا چوژن!
چے شڑ چوئے تو تا تو چنگ، تھوان چے چی لائے تاؤ منتھیان۔
انٹرنیشنل چیوای تنگ یاؤ شڑ شئین
(اٹھو! فاقہ کش، بد مستو،
اٹھو دنیا بھر کے مظلوموں)

*

Regd No : S - 2772
Weekly "Al - Fatah" Karachi
21-28, OCTOBER-1971

